پانچ جاتے ہیں چار پھرتے ہیں

پاکستان میں سیاسی تبدیلی آ گئی۔نواز شریف نے مسند اقتدار پر قدم رکھ دیا۔یہ وہ جگہ ہے جہاں سے 14 برس قبل ان کو نکالا گیا تھا۔ اس کے بعد اس مسند پر ظفر اللہ جمالی، چوہدری شجاعت،شوکت عزیز،محمد میاں سومرو، یوسف رضا گیلانی، راجہ پرویز اشرف اور میر ہزار خان کھوسو فائز رہے۔مگر سب ایک کے بعد ایک رخصت ہو گئے۔جبکہ میاں نواز شریف کو اقتدار سے فارغ کرنے والے پرویز مشرف کو بھی اقتدار چھوڑنا پڑا اور ان کے انتخاب کے وقت وہ اسی شہر اسلام آباد میں نظر بند تھے۔اس کہانی کا خلاصہ یہ ہے کہ نواز شریف کو بھی جلد اقتدار چھوڑنا ہوگا۔

یہ حکومت کے اقتدار کی کہانی ہے جسے ہر حال میں ہر شخص کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ زندگی کے اقتدار کی کہانی بھی کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ یہ دھرتی جس پر آج ہم آباد ہیں۔کبھی اس پر فرعون، شداد، چنگیز،سکندر اور دارا جیسے انتہائی طاقتور لوگ حکمران تھے۔صرف سو برس قبل دنیا کی تقریباً سو فیصد آبادی ان لوگوں پر مشتمل تھی جو آج نہیں اور اگلے سو برسوں میں وہ تمام لوگ مر چکے ہوں گے جو آج اس دھرتی کے خشک و تر کے مالک بنے ہوئے ہیں۔

سب کا انجام سب کی منزل قبر کا گڑھا ہے۔مگر انسان کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اس سب سے بڑی حقیقت سے غافل ہو کر جیتا ہے۔ وہ ایسے جیتا ہے جیسے اسے کبھی نہیں مرنا۔مگر جب مرتا ہے تو ایسا ہو جاتا ہے جیسے کبھی موجود ہی نہ تھا۔ یہ غافل حرام مال جمع کرتا ہے۔مگر چھوڑ کر قبر میں جا گرتا ہے۔ یہ حرام کمائی سے بڑے گھر بناتا ہے ۔لیکن قبر کی تنگی اس کا انجام بنتی ہے۔ وہ مصاحبوں کے جمگھٹے میں جیتا ہے۔اور آخر کار چار کاندھوں پر لاد کر قبر میں ڈال دیا جاتا ہے۔

کاش یہ حقیقت ہر حکمران کو یاد رہے۔کاش یہ حقیقت ہر انسان کو یاد رہے۔

ہائے غافل وہ کیا جگہ ہے جہاں
پانچ جاتے ہیں چار پھرتے ہیں

اصول پسندی

بعض اوقات سڑکوں پر پیش آنے والے حادثات سے لوگوں کو بچانے کے لیے یہ جملہ کہا جاتا ہے کہ تیز رفتاری خطرناک چیز ہے۔ یہ بات اپنی جگہ ٹھیک ہے لیکن دنیا بھر میں یہ ضابطہ ہے کہ بڑی سڑکوں پر مخصوص احتیاطی تدابیر کے ساتھ تیز رفتاری سے گاڑی چلانے کے لیے سڑک کا ایک حصہ مختص کیا جاتا ہے۔ اسے عام طور پر فاسٹ ٹریک کہا جاتا ہے۔ ہائی وے پر فاسٹ ٹریک پر 120 سے لے کر 140 کلومیٹر کی انتہائی تیز رفتار پر گاڑی چلانے کی اجازت ہوتی ہے۔ جبکہ شہر کی بڑی سڑکوں پر یہ رفتار 60 سے 80 کلومیٹر فی گھنٹہ تک ہوتی ہے۔

ایسے فاسٹ ٹریک پر ہلکی رفتار سے گاڑی چلانا اتنا ہی خطرناک ہوتا ہے جتنا کسی عام سڑک پر تیز چلانا۔ بدقسمتی سے پاکستان میں جہاں ٹریفک کی ہر دوسری خلاف ورزی عام ہے وہیں سڑکوں کے فاسٹ ٹریک پر ہلکی رفتار سے، مزے لے کر باہمی گفتگو کرتے ہوئے گاڑی چلانا عام رویہ ہے۔ بلکہ اب تو یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ڈرائیونگ کے دوران موبائل فون پر گفتگو ہو رہی ہے اور فاسٹ ٹریک پر خراماں خراماں جا رہے ہیں۔ یہ آہستہ روی احتیاط نہیں ایک سنگین لاپروائی ہے۔ یہ رویہ اس بات کا عکاس ہے کہ ڈرائیور یا تو قانون سے واقف نہیں یا اسے اس کی پروا نہیں۔

یہ رویہ اور اس جیسے دیگر رویے اس بات کے مظہر ہیں کہ ہم لوگوں کی تربیت اصولوں کی بنیاد پر نہیں بلکہ مزاج اور جذبات کی بنیاد پر ہوئی ہے۔ ہم زندگی اصول پر نہیں مزاج اور مرضی پر گزارنے کے عادی ہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ کہاں ہمیں تیز چلنا ہے اور کہاں ہلکے۔ ہم نہیں سوچتے کہ کہاں بولنا ہے اور کہاں چپ رہنا ہے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ کس معاملے میں اپنی مہارت کی بنا پر ہمیں رائے دینی چاہیے اور کہاں اپنی جہالت کی بنا پر خاموش رہنا چاہیے۔

اصول کے بجائے مزاج کے تحت زندگی گزارنا وہ رویہ ہے جو ہماری بیشتر اجتماعی خرابیوں

اور زندگی میں بے سکونی کا ذمہ دار ہے۔ جب تک یہ رویہ نہیں بدلتا ہمارے معاملات کا درست ہونا بہت مشکل ہے۔

خداپرست

مولانا فتح محمد صاحب مولانا مودودی کے پرانے رفقا میں سے تھے جو 1944 میں مولانا مودودی کی قائم کردہ جماعت اسلامی میں شامل ہوئے۔ سن 2008 میں اپنی وفات تک انہوں نے اگلے 64 برس اسی مشن کی خدمت میں گزار دیے جسے ابتداءً درست سمجھا تھا۔

مولانا فتح محمد صاحب کے انتقال کے بعد ان کی زندگی اور شخصیت کے حوالے سے ان کے احباب اور رفقا کے تاثرات پر مشتمل ایک کتاب شائع ہوئی۔ اس کتاب میں ایک مضمون ان کی پوتی محترمہ مریم عبدالحمید کا بھی ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے لکھا ہے مولانا فتح محمد صاحب کا مولانا مودودی سے پہلا تعارف ایک دوست کے ذریعے سے ہوا۔ انہوں نے مولانا کی بعض کتابیں ان کو دیتے ہوئے کہا کہ یہ کتابیں ایک عالم دین نے اس نصیحت کے ساتھ ان کو دی تھیں کہ تحریریں اچھی ہیں مگر لکھنے والا اچھا آدمی نہیں ہے۔ تاہم مولانا فتح محمد صاحب نے کھلے دل سے ان کتابوں کو پڑھا اور دوسروں کو بھی پڑھایا۔

یہ واقعہ ایک متعصب مذہبی شخص اور ایک سچے خداپرست کا فرق بیان کرتا ہے۔ ایک سچے شخص خداپرست کی اصل وابستگی اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوتی ہے۔ وہ کسی سنی سنائی بات پر رائے سازی نہیں کرتا بلکہ خود دیانت داری سے چیزوں کو سمجھ کر اور تحقیق کر کے رائے قائم کرتا ہے۔ ایسے شخص کی رائے چاہے غلط ہو، مگر اس منصفانہ طریقہ کار کی بنا پر وہ اللہ کے حضور جوابدہی سے بچ جاتا ہے۔ اس کے برعکس ایک متعصب شخص نفرت اور تعصب کی بنیاد پر پھیلائے گئے جھوٹے پروپیگنڈے کو آخری حقیقت سمجھتا ہے۔ وہ بہتان والزام پر مبنی باتوں کو سچ سمجھ کر رائے بناتا اور

دوسرے تک بڑے اعتماد سے پہنچا دیتا ہے۔

یہ وہ رویہ ہے جو کل قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مردود قرار پائے گا اور انسان کو بدترین ذلت اور رسوائی سے دوچار کرے گا۔

پٹا ہوا مہرہ

ایک صاحب اپنی فیملی کے ہمراہ والد صاحب کے ساتھ رہتے تھے اور والد صاحب ہی ان کا خرچہ اٹھاتے تھے۔ ان کے اپنے والد صاحب سے کچھ اختلافات ہوگئے۔ والد صاحب نے اس پر ناراض ہوکر ان کو گھر سے نکل جانے کا حکم دیا۔ انہوں نے اس کے جواب میں ادب سے عرض کردیا کہ ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔

انسانوں کی کہانی میں ایسے کئی موڑ آتے ہیں جن کا مشاہدہ دن رات اس معاشرے میں کیا جاسکتا ہے۔ تاہم باپ اور بیٹے کی یہ کہانی بعض اوقات اللہ اور بندے کی کہانی بھی بن جاتی ہے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب زندگی میں بندہ اپنے رب سے کچھ مانگتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی دعا و فریاد کا کوئی جواب نہیں آتا۔ بلکہ بارہا انسان کو نقصان اور پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایسے میں کچھ لوگ اللہ سے مایوس اور بددل ہوجاتے ہیں۔ انہیں رب سے شکایت پیدا ہوجاتی ہے۔ بعض لوگ غیر اللہ کے در پر جا پڑتے ہیں اور انہی سے حاجت روائی کی درخواست کرتے ہیں۔

تاہم بندوں کی ایک قسم اور بھی ہوتی ہے۔ وہ رب کو پکارتے ہیں اور جب جواب نہ ملے تو ناراض ہونے کے بجائے اللہ تعالیٰ سے کہتے ہیں۔ آپ نے جو کرنا ہے کرلیجیے۔ ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔ یہ الفاظ ایک ایسے انسان کے منہ سے نکلتے ہیں جو پٹے ہوئے مہرے کی طرح ہوتا ہے۔ جو اپنی شکست کی آواز آپ ہوتا ہے۔

اس کے بعد کچھ بھی نہیں ہوتا......آسمان سے فرشتے نہیں اترتے۔زمین پر بھونچال نہیں آتا۔ پٹا ہوا مہرہ درِ مالک پر پڑا رہتا ہے۔ جو سننے والا ہے وہ سب دیکھتا ہے، مگر خاموش رہتا ہے۔اس کے ہاں سے کوئی جواب نہیں آتا۔حاملین عرش محو حیرت رہ جاتے ہیں۔ جبریل ومیکائیل پر سکتہ طاری ہوجاتا ہے۔ملائکہ دم سادھے کھڑے رہتے ہیں۔زمین وآسمان ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہتے ہیں۔شجر وحجر دانتوں تلے انگلیاں دبالیتے ہیں۔سورج اور ستارے نظریں بچا کر یہ منظر دیکھتے ہیں۔دن ورات سارے دھندے چھوڑ کر تماشائی بن جاتے ہیں۔ہوا اور فضا،صحرا اور سمندر، دریا اور جنگل، چرند و پرند،کوہ وچمن سب اس بے رخی پر دم بخود رہ جاتے ہیں کہ مانگنے والا کیسے محروم رہ گیا۔

وقت گزر جاتا ہے۔کون کسی کے لیے رکتا ہے۔سو دنیا بھی اپنے اپنے دھندوں میں لگ جاتی ہے۔ملائکہ فرمانبرداری میں؛ دن رات،سورج چاند،تارے سیارے گردش میں؛شجر وحجر، ہوا وفضا،صحرا اور سمندر، دریا اور جنگل، چرند و پرند،کوہ وچمن غرض تمام ساکنان ارض معمولات کی ادائیگی میں مشغول ہوجاتے ہیں۔پٹا ہوا مہرہ درِ مالک پر پڑا رہتا ہے۔

پھر ایک روز حاملین عرش سے پوچھا جاتا ہے: یہ کون ہے اور کیا کہتا ہے؟

بہت اعلیٰ مقام والے بہت ادب کے ساتھ جواب دیتے ہیں۔یہ ایک پٹا ہوا مہرہ ہے۔اب تو کچھ نہیں بولتا۔مگر جب تک بول سکتا تھا آپ کا نام لے کر کہتا تھا : ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔

زیادہ دیر نہیں گزرتی کہ حاملین عرش کے پاس ایک فیصلہ آتا ہے:

اس پٹے مہرے کو تقدیر کی بساط پر دنیا و آخرت کا بادشاہ بنادو۔

حاملین عرش محو حیرت رہ جاتے ہیں۔ جبریل و میکائیل پر سکتہ طاری ہوجاتا ہے۔ملائکہ دم سادھے کھڑے رہتے ہیں۔زمین وآسمان ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہتے ہیں۔شجر وحجر دانتوں تلے انگلیاں دبالیتے ہیں۔سورج اور ستارے نظریں بچا کر یہ منظر دیکھتے ہیں۔ دن ورات سارے

دھندے چھوڑ کر تماشائی بن جاتے ہیں۔ ہوا اور فضا، صحرا اور سمندر، دریا اور جنگل، چرند و پرند، کوہ و چمن سب اس عنایت پر دم بخود رہ جاتے ہیں کہ پٹا ہوا مہرہ کیسے بادشاہ بن گیا۔

باپ بیٹے کو نہیں چھوڑ سکتا۔ خدا بندے کو کیسے چھوڑ سکتا ہے۔ پٹا ہوا مہرہ اس لیے بادشاہ بن گیا۔

جھوٹ اور مسلمان

واقعہ افک سیرت نبوی کا ایک اہم واقعہ ہے۔ یہ منافقین کی طرف سے خانوادہ نبوی کو نشانہ بنانے کی سب سے بڑی کوشش تھی جس میں سیدہ عائشہ پر بدکاری کی تہمت لگائی گئی۔ اس الزام کی بنا پر سیدہ اور ان کے گھر والے خصوصاً ان کے والد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور سب سے بڑھ کر ان کے شوہر رسول خدا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سخت ذہنی اذیت سے دوچار رہے۔ اس دوران میں تمام مسلمان بھی گومگو اور باہمی اختلاف و انتشار کی کیفیت میں مبتلا رہے۔ ایک مہینے تک بہتان تراشی اور ایذا رسانی کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد کہیں جا کر سورہ نور میں حضرت عائشہ کی برات اللہ تعالیٰ نے خود نازل کی اور یہ طوفان تھما۔

قرآن مجید کے ایک طالبعلم کے سامنے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس واقعے کی تردید میں ایک مہینہ کیوں لیا؟ وہ چاہتے تو پیدا ہوتے ہی مسئلے کو ختم کر دیتے۔ نہ اہل بیت نبی اس اذیت سے گزرتے نہ سیدہ کا خاندان اتنی پریشانی اٹھاتا اور نہ مسلم معاشرہ ایک مہینے تک ایسے انتشار کا شکار رہتا جس میں مسلمانوں کے باہمی جھگڑے کی نوبت آ جاتی۔ جو وحی ایک مہینے بعد اتری وہ اگلے دن بھی اتر سکتی تھی۔ انسانوں کی عام نفسیات کے لحاظ سے دیکھا جائے تو عالم الغیب پروردگار کی یہ خاموشی بظاہر سیدہ کے خلاف ان کا فیصلہ معلوم ہوتی تھی۔ یہی سبب ہے کہ بعض انتہائی مخلص صحابہ جن میں حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نام سر فہرست ہے اس جھوٹی مہم جوئی کا شکار ہو کر سیدہ پر الزام لگانے والوں میں شریک ہو گئے۔

تاہم قران کریم نے سیدہ کی برات میں جو کچھ کہا وہ اس میں اس حکمت الٰہی کی بھی وضاحت ہو جاتی ہے کہ کیوں اللہ رب کریم نے اپنے محبوب نبی اور ان کی محبوب اہلیہ کی اتنی ذہنی اذیت کو گوارا کیا اور پھر کہیں جا کر ایک مہینے کے انتظار کے بعد ان کی حق میں وحی اتاری۔

قرآن مجید کے اس بیان سے جو سورہ نور (24) آیت 11 تا 18 پر مشتمل ہے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کیا تھی۔ ہم اسے ذیل میں بیان کر رہے ہیں۔

1) کسی بے گناہ پر الزام و بہتان لگانا اگرچہ سنگین ترین اخلاقی جرائم میں سے ایک ہے تاہم یہ ہمیشہ انسانی معاشروں کا حصہ رہا ہے اور رہے گا۔ نزول قرآن کے وقت تو وحی کر کے کسی کی برات کا فیصلہ کیا جا سکتا تھا، مگر عام لوگوں کے لیے یہ فیصلہ قیامت کے دن ہی ہوگا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ایک ماہ تک انتظار کر کے یہ دیکھا کہ لوگ اپنے طور پر ایسے معاملات میں کیا رویہ اختیار کرتے ہیں۔

جب لوگوں کا اختلاف ختم نہ ہوا بلکہ مخلص ترین لوگ اس مہم کوئی کا شکار ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے اس مہم جوئی کو افک یعنی جھوٹ قرار دے کر سیدہ کی پاکدامنی کا اظہار خود کیا لیکن ساتھ میں یہ واضح کیا کہ ایسے مواقع پر مسلمانوں کو ایک دوسرے کی متعلق نیک گمان ہی کرنا چاہیے تھا۔ کیونکہ الزام و بہتان کی کسی مہم میں ایک طرف مہم جوئی کرنے والے لوگ ہوتے ہیں اور دوسری طرف اس مہم کا نشانہ بننے والا شخص۔ ایسے میں عام لوگوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ ہمیشہ حسن ظن سے کام لیں۔ وہ ایسی کسی بات کو سنتے ہی کہہ دیں کہ یہ بہتان ہے اور ہمیں حق نہیں کہ ہم ایسی کوئی بات زبان پر لائیں۔ اس کے برعکس بغیر علم و تحقیق کے اس بات کو آگے پھیلانا، خود ایک منفی رائے قائم کرنا، دوسروں کی رائے سازی کرنا ایک بہت بڑی بات اور اللہ کے عذاب کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔

2) سیدہ کے معاملے میں بہتان تو زنا کا لگایا گیا تھا، مگر تردید کرتے وقت قرآن مجید نے زنا کا لفظ استعمال ہی نہیں کیا۔ اس کا ایک سبب یہ ہے کہ قرآن مجید الزام و بہتان کے اس رویے پر تنقید کو صرف زنا کے الزام کی حد تک محدود نہیں کرنا چاہتا بلکہ اس کے پیش نظر یہ بات ہے کہ کسی مسلمان پر اگر کسی پہلو سے کوئی بھی سنگین الزام لگایا جائے، جس طرح آج کل مسلمانوں کی نیت

اوران ایمان پر براہ راست حملے کر کے انہیں کافر اور گمراہ قرار دیا جاتا ہے، اس رویے کی حوصلہ شکنی کی جائے۔ کسی کی عزت پر حملہ کرنا بڑا سنگین جرم ہے، مگر اس کے ایمان اور نیت کو ہدف بنانا اس سے بھی کہیں زیادہ سنگین جرم ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم نے اس چیز کو سمجھا اور اس کو بیان کیا ہے۔ چنانچہ بخاری و مسلم اس مفہوم کی متعدد روایات ہمیں ملتی ہیں جس میں واضح کیا گیا ہے کہ کسی مسلمان کو کافر کہنا خود اپنے کفر کا سبب بن جاتا ہے۔ یہی وہ دینی تعلیم ہے جس کا سمجھنے والا ہمیشہ اس بات میں محتاط رہے گا کہ کسی مسلمان پر کفر و گمراہی کے فتوے دے یا اس طرح کی چیزوں کو آگے بڑھائے، کیونکہ اس کے نتیجے میں اپنا ایمان سلب ہو جاتا ہے۔

2) جو لوگ اس وقت الزام لگا رہے تھے ان سے کہا گیا کہ وہ چار گواہ لے کر آئیں۔ یہ بات عقل عام سے سمجھی جا سکتی ہے کہ زنا چھپ کر کیا جاتا ہے چار لوگوں کے سامنے نہیں۔ چنانچہ بہت سے لوگ اس بنا پر قرآن کا مذاق بھی اڑاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے شرط ہی وہ رکھی ہے جو کبھی پوری نہیں کی جا سکتی۔ مگر در حقیقت الزام کو ثابت کرنے کے لیے اتنی سخت ترین شرط لگانے کا مقصد ہی یہی ہے کہ معاشرے میں الزام لگانے کی سوچ کو ختم کیا جا سکے۔ جب تک کہ نا قابل تردید ثبوت میسر نہ ہوں، کسی بھی شخص کے خلاف کسی پہلو سے زبان نہ کھولی جائے۔

یہ چند نکات ہیں جو اس عظیم حکمت کا بیان ہیں جس کی بنا پر سیدہ کی براءت ظاہر کرنے میں اللہ تعالیٰ نے ایک ماہ لیا اور اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ عام مسلمانوں کی تربیت کر کے ان پر واضح کیا جائے کہ ایسے معاملات میں ان کا رویہ کیا ہونا چاہیے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کا باہمی انتشار شیطان کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ یہ انتشار ہمیشہ الزام و بہتان کی نفسیات سے پیدا ہوتا ہے۔ ہر معاشرے میں شیطان کے نقش قدم کی پیروی کرنے والے لوگ ہوتے ہیں جو الزام و بہتان لگاتے ہیں۔ انہیں روکا نہیں جا سکتا۔ اصل ذمہ داری عام مسلمانوں کی ہے کہ وہ کبھی کسی مہم جوئی کا حصہ نہ بنیں۔ ہمیشہ حسن ظن سے کام لیں۔ ہر سنی سنائی بات کو آگے نہ پھیلائیں۔ پوری تحقیق اور یقین کے بغیر کسی شخص کے بارے میں

کوئی بات زبان سے نہ نکالیں۔کسی کی جان، مال،نیت، ایمان، آبرو پر حملہ بدترین جرم ہے جو ایمان کو غارت کر دیتا ہے۔قیامت کے دن جب اصل زندگی شروع ہوگی تو ایسے جرائم کی سزا دیکھ کرلوگ خواہش کریں گے کہ کاش ان کی زبان نہ ہوتی جس سے وہ بولتے اوران کے ہاتھ نہ ہوتے جن سے وہ لکھتے۔

پروفیسرمحمد عقیل

پریشان ہونا چھوڑیئے، جینا شروع کیجئے

اصول نمبر 3۔ پریشانیوں کے نقصانات پہچانیں

کیس اسٹڈی:

"غزالی کو پریشان ہونے کی عادت ورثے میں ملی تھی۔ مالی اعتبار سے وہ اچھی پوزیشن میں تھا، تعلیم بھی مناسب تھی، گھربار، ملازمت، اولاد، بیوی غرض وہ سب کچھ حاصل تھا جو ایک اچھی زندگی گذارنے لئے ضروری ہوتا ہے۔لیکن چھوٹی چھوٹی باتوں پر پریشان ہوجانا اس کی مستقل صفت بن چکی تھی۔کبھی اسے یہ اندیشہ ہوتا کہ ملازمت ختم ہوگئ تو کیا ہوگا؟۔کبھی وہ بچوں کے مستقبل کے خودساختہ مسائل کوسوچتا تو کبھی باہر نکلنے پر اسے ایکسیڈنٹ کا خوف ستانے لگتا۔ اس کے دوست احباب اسے سمجھاتے کہ یہ سب سوچیں وہم ہیں اوران کوخود پرحاوی کرنا فضول ہے۔لیکن اسے اس طرح کی زندگی کی عادت ہوگئ تھی کیونکہ اس طرز زندگی میں خودکواوپر اٹھانے کے لئے محنت نہیں کرنی پڑتی۔

لیکن وہ بھول گیا تھا کہ ان تفکرات کی ایک قیمت ہوتی ہے۔آہستہ آہستہ اس کے چڑچڑے پن کی بنا پر بیوی اور بچے اس دور ہونے لگے،خوف کا یہ عالم ہوا کہ رات کواچانک آنکھ کھل جاتی اور پھر نیند غائب ہوجاتی، دفتری معاملات الٹ پلٹ ہونے لگے۔ان سب باتوں کے علاوہ

صحت کی خرابی بھی ظاہر ہوگئی۔ شوگر، بلڈ پریشر اور ڈپریشن جیسی بیماریوں نے حملہ کر دیا جبکہ ڈاکٹروں نے دل کی کمزوری کا بھی عندیہ دے دیا۔

اب اس کی خود ساختہ پریشانیاں حقیقی مسائل میں تبدیل چکی تھیں۔ وہ ان سب سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا لیکن کئی دہائیوں سے جن مسئلوں کو وہ پال پوس کر بڑا کرتا رہا وہ اب طاقتور ہو چکے تھے اور انہیں جڑ سے نکالنا مشکل تر تھا۔ بہر حال ایک دن ایک اور مہلک بیماری حملہ آور ہوئی۔ بلڈ پریشر کے ایک جاندار حملے نے اس کے دائیں حصے کو مفلوج کر ڈالا۔ وہ آج اپنے پلنگ پر بیٹھا یہ سوچتا رہتا ہے کہ وہ اگر جانتا کہ ان پریشانیوں کو پالنے کی کیا قیمت ہے تو ان کا ابتدا میں ہی قلع قمع کر دیتا لیکن آج ان پریشانیوں نے اس کا کام تمام کر دیا"۔

وضاحت:

جدید میڈیکل ریسرچ سے یہ بات ثابت ہوگئ ہے کہ خوف، بے چینی، اضطراب اور پریشانیاں بے شمار بیماریوں کا سبب بنتی ہیں۔ Nervous Stomach Trouble کے مصنف ڈاکٹر جوزف لکھتے ہیں کہ ہمیں کھانے پینے کی بد پرہیزی کی بنا پر معدے کے السر کا اتنا خدشہ نہیں ہوتا جتنا غم، فکر اور ٹینشن کی بنا پر ہوتا ہے۔

ہمارے تفکرات، خوف، مایوسی، تھکان محرومی وغیرہ بے شمار نفسیاتی اور جسمانی بیماریوں کی جانب آہستہ آہستہ دھکیلتے ہیں۔ ان بیماریوں میں بلڈ پریشر، امراض قلب، تھائیرائیڈ، شوگر اور گٹھیا جیسی مہلک اور تکلیف دہ بیماریاں شامل ہیں۔ ان جسمانی بیماریوں کے علاوہ یہ پریشانیاں ہماری ازدواجی زندگی کی ناکامی، سوشل لائف کی بربادی، نفرت و کدورت، غصہ وانتقام، افسردگی وڈپریشن جیسی مصیبتوں کا سبب بھی بنتی ہیں۔

لوگ اکثر یہ کہتے ہیں کہ اگر ان تفکرات سے نجات حاصل کر لی جائے تو زندگی میں ترقی ممکن

نہیں۔ یہی فکراور ٹینشن ہے جو ایک طالب علم کو پاس کرواتی، ایک ملازمت پیشہ شخص کی ترقی کا سبب بنتی اور ایک کاروباری فرد کی کامیابی کا ضامن ہوتی اور ایک خاتون خانہ کو بہتر مستقبل کی ضمانت دیتی ہے۔ چنانچہ ان تفکرات سے اگر نجات حاصل کرلی جائے تو ترقی کا یہ سفر رک جائے گا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہماری زندگی میں بے شمار مسائل اور ان گنت پریشانیاں ہوتی ہیں۔ لیکن کیرئر میں کامیابی اور زندگی کے مجموعی ارتقاء میں توازن کا ہونا ضروری ہے۔ ایک شخص جوانی کے قیمتی لمحات، صحت اور سوشل لائف غرض سب کچھ داو پر لگا کر ایک بہت بڑا ابزنس مین یا ایک اعلیٰ عہدے کا حامل بن جاتا ہے۔ لیکن جب وہ دنیا کی ساری نعمتیں اور آسائشیں اپنے گرد جمع کرکے دنیا کے سامنے ایک کامیاب انسان بن کر کھڑا ہوتا ہے تو اس کا باطن ناکامی کا ثبوت دے رہا ہوتا ہے۔ وہ شخص بیماری کے سبب نارمل اور میٹھا کھانا کھانے سے محروم ہوجاتا ہے، وہ وقت کی کمی کے سبب اپنے اردگرد کی آسائشوں کو انجوائے ہی نہیں کرپاتا، وہ اپنی اولاد کے ساتھ کھیلنے کے قابل نہیں ہوتا، وہ اپنی بیوی کو مطلوبہ وقت دینے سے قاصر ہوتا ہے، وہ اپنی دولت کا خطیر حصہ علاج کی نظر کردیتا اور اکثر اوقات وہ اپنی اوسط عمر سے پہلے ہی اس دنیا سے کوچ کرجاتا ہے۔ اس کی زندگی کی خوشیوں کو اگر گنا جائے تو وہ شاید مجموعی طور پر ایک کسان کی خوشیوں سے بھی کم نکلیں گی۔ یہ سب کچھ اس وجہ سے ہوا کہ اس نے ٹوٹل سکسیس **مینجمنٹ** Total Success Management کی بجائے زندگی کے محض ایک یا دو پہلووں پر ہی ساری توانائی صرف کردی اور منہ کی کھائی۔ چنانچہ وہ شخص کسی طور کامیاب قرار نہیں دیا جاسکتا جو تفکرات اور پریشانیوں کے بیماریوں میں گرفتار ہوجائے اور اس سبب زندگی کی نعمتوں سے ہاتھ دھو بیٹھے خواہ وہ کتنے ہی بڑے عہدے پر فائز کیوں نہ ہو۔

اس ضمن میں جو دوسرا پہلو قابل غور ہے وہ یہ کہ تفکرات تو بے شمار ہیں لیکن ان میں سے کچھ

مسائل تو حقیقی ہوتے ہیں جبکہ اکثر مسائل فرضی ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک غریب آدمی کے لئے یہ سوچنا کہ آج رات کھانے کا بندوبست کس طرح کرنا ہے، یہ ایک حقیقی مسئلہ ہے۔ لیکن اسی غریب آدمی کا یہ سوچنا غیر حقیقی ہے کہ اگر کل صبح زلزلہ آ گیا تو کیا ہوگا۔ اسی طرح کچھ پریشانیوں کا حل ہمارے اختیار میں ہوتا ہے جبکہ اکثر مسائل لاینحل ہوتے ہیں۔ جیسے گھر میں اگر پانی نہیں ہے تو یہ مسئلہ قابل حل ہے اور اس پر آرام سے نہیں بیٹھا جا سکتا۔ لیکن دوسری جانب لوڈ شیڈنگ کا کوئی انفرادی حل نہیں چنانچہ اس ماحول میں خود کو ایڈجسٹ کرنا ہی مناسب ہے۔

پریشانیاں اگر حقیقی اور قابل حل ہوں تو ان کا حل تلاش کر کے انہیں ذہن سے نکال دیں۔ اگر یہ مسئلے غیر حقیقی یا ناقابل حل ہیں تو انہیں پہلے ہی سے ذہن سے نکال دیں۔ یعنی کسی بھی صورت میں پریشانی کو زیادہ عرصے دل میں نہ رکھیں۔ اور اگر رکھیں تو پھر ان کی قیمت چکانے کے لئے بھی تیار ہو جائیں۔

اسائنمنٹ

اپنی زندگی کا جائزہ لیں اور ان پریشانیوں کی لسٹ بنائیں جو غیر حقیقی ہیں۔ پھر انہیں ذہن سے نکال دیں کیونکہ وہ غیر حقیقی ہیں۔

ان تفکرات کی لسٹ تیار کریں جو ناقابل حل ہیں لیکن پھر بھی وہ آپ کو تنگ کرتے رہتے ہیں۔

اپنے اردگرد لوگوں کا جائزہ لیں اور ان لوگوں کی بیماریاں تحریر کریں جو تفکرات کی بنا پر ان میں مبتلا ہوئے۔

اگر آپ بھی پریشانیوں کی بنا پر کسی بیماری کا شکار ہیں تو اس کا نام لکھیں اور اس سے نپٹنے کی حکمت عملی تیار کریں۔

آپ تحریر کریں کہ آپ کی زندگی کا مقصد کسی ایک پہلو میں کامیابی ہے یا ٹوٹل سکسیس

مینجمنٹ؟ ٹوٹل سکسیس مینجمنٹ کے تصور کو واضح کریں۔

پروفیسر محمد عقیل

گرمی بہت شدید ہے

وہ پسینے میں شرابور تیز تیز قدموں سے اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھا۔ دھوپ کی شدت اس کی جلد جھلسائے دے رہی تھی۔ نمی کا یہ عالم تھا کہ اس کے جوتے تک تر ہو چکے تھے۔ مسجد کچھ ہی دور تھی لیکن یہ چند ساعتوں کا فاصلہ صدیوں پر محیط لگ رہا تھا۔ وہ چلتا رہا اور ساتھ ہی گرمی کو برا بھلا بھی کہتا رہا۔ اس دوران اس نے بے شمار مغلظات سورج کی شان میں بکیں۔ ان سب اقدامات کے باوجود حالات جوں کے توں تھے۔ آسمان پر بادل کا ایک ٹکڑا تھا نہ زمین پر سائے کی کوئی پناہ۔ اس کے ذہن میں وسوسے آنے لگے کہ جب وہ مسجد میں داخل ہوگا تو لوڈ شیڈنگ کی بنا پر بجلی نہیں ہوگی۔ گرمی اور حبس کے عالم میں مولانا صاحب نہ جانے کتنا لمبا خطبہ دیں اور کتنی طویل نماز پڑھائیں۔ وہ گذشتہ کئی ہفتوں سے جمعہ کی نماز ترک کر رہا تھا اور آج ہمت کر کے گھر سے نکلا تھا۔ اچانک اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ جمعہ کی نماز ترک کر دے اور مسجد نہ جائے۔ جب پہلے کچھ نہیں ہوا تو اب بھی کچھ نہ ہوگا۔ بالآخر اس نے واپسی کا ارادہ کرلیا اور گھر آ گیا۔ گھر پہنچ کر اس نے خود کو آرام دہ بستر پر ڈالا اور ٹی وی دیکھنے میں مصروف ہوگیا۔

اگلے دن جب سو کر اٹھا تو دفتر جانا تھا۔ گرمی کی شدت میں کل کی نسبت اضافہ تھا۔ اس کا دفتر گھر سے دس کلو میٹر دور تھا اور یہ راستہ اسے بس میں طے کرنا تھا۔ چاروناچار وہ تیار ہوا اور بس

اسٹاپ تک پہنچا۔ وہاں لوگوں کا جم غفیر تھا اور قریب میں کوئی سایہ دار جگہ نہ تھی۔ چنانچہ وہ بھی ایک کونے میں کھڑا ہو کر دھوپ میں تپتا رہا۔ پندرہ منٹ بعد بس آئی جو مسافروں سے بھری ہوئی تھی۔ وہ بھی ایک پاؤں پھنسا کر دروازے میں لٹک گیا۔ جب دفتر آیا تو اس کے بازو شل ہو چکے تھے اور پسینوں کے باعث برا حال تھا۔ یہاں بھی اس نے سوچا کہ واپس گھر ہو لے لیکن پھر اسے خیال آنے لگا کہ اگر چھٹی کی تو باس کا غصہ برداشت کرنا پڑے گا۔ اس سے قبل وہ علالت کی بنا پر پہلے بھی چھٹیاں کر چکا تھا۔ مزید رخصتوں سے اس کی نوکری خطرے میں پڑ سکتی تھی۔ جب دفتر میں داخل ہوا تو بجلی غائب۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اس نے کرسی سنبھالی اور کام میں جت گیا۔

ابھی وہ کام شروع ہی کر رہا تھا کہ اچانک کمپیوٹر پر ایک ای میل کھل گئی جس میں یہ حدیث لکھی تھی:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص کاہلی و سستی کی بناء پر متواتر تین جمعہ کی نمازیں چھوڑے گا تو اللہ اس کے دل پر مہر لگا دے گا۔

یہ پڑھ کر خوف کے مارے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ خدا نے اسے اپنی بندگی سے خارج کر دیا ہو۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ کوئی اسے مخاطب کر کے یہ کہہ رہا ہے کہ تم نے باس کے خوف سے تو دھوپ کی حدت برداشت کر لی لیکن خدا کا کوئی خیال نہ کیا۔ وہ باس جو صرف چند ٹکے دیتا اور کام گدھوں کی طرح لیتا ہے اس کا تو خوف ہے لیکن وہ خدا جس نے تمہیں بچپن سے جوانی تک صرف دیا ہی ہے اور کچھ نہیں لیا اس رحمان سے کوئی شرم و حیا نہیں۔

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ لنچ کرنے کی بجائے اٹھا اور سامنے مسجد میں نماز ظہر ادا کرنے چل پڑا۔ سورج اب بھی آگ اگل رہا تھا اور گرمی کی شدت پہلے سے زیادہ تھی۔ لیکن اب اس نے خدا کی [illegible] اطاعت کا قلادہ ڈال لیا تھا اور [illegible] کوئی شکایت نہیں۔

"تیسری روشنی"

مصنف: ابو یحییٰ

شمائلہ عثمان

رب راضی تو سب راضی

بابا حیدر بہت زمانے کے بعد نظر آئے۔ وقت کی دھول نے اگرچہ ان کے کندھے جھکا دیے تھے، لیکن آج بھی وہ کام کے متلاشی تھے۔ جب ان کا حال پوچھا تو ہمیشہ والا جواب، جو اب جوان کا خاصہ تھا، کہ ''رب راضی تو سب راضی''۔ ہمیشہ کی طرح چہرے پر سکون تھا لیکن قریب قریب ستر سال کی عمر میں کام کی تلاش کی وجہ پوچھی تو پتہ چلا کہ اس عمر میں بھی ذمہ داریاں ختم ہونے کے بجائے بڑھتی جا رہی ہیں۔ جوان بیٹا شہر کے حالات کی نظر ہو گیا اور دوسرا بیٹا نشہ کی لت کا شکار ہو گیا اور اب ان دونوں کے بیوی بچوں کی ذمہ داری اس کے ناتواں کاندھوں پر تھی۔ وہ کسی مالی مدد کے بجائے کام کر کے زرق حلال سے بچوں کو پالنا چاہتا تھا اور اللہ کی ہر رضا میں راضی تھا۔

ہمارے آس پاس ایسے بے شمار لوگ نظر آئیں گے۔ جنھیں یہ پتہ نہیں کہ آج مزدوری ملے گی یا نہیں، وہ رات کو بچوں کا پیٹ بھر بھی پائیں گے یا نہیں لیکن دل میں رب کو راضی رکھنے کی ایک تڑپ ہمہ وقت موجود ہے۔ یہی دنیاوی مسائل میں گھرا ہوا مخصوص طبقہ ہے جو ہر دور میں رہا ہے اور اپنے حصے کی تمام پریشانیوں کے پہاڑ اس دنیا ہی میں سر کر رہا ہے، بغیر اللہ سے شکوہ کیے، نبیوں پر ایمان اور اللہ کی پہچان سب سے پہلے ایسے ہی انسانوں نے کی ہے۔ محدود عقل، محدود وسائل، محدود نظر رکھنے والے شاید یہی وہ اللہ کے مقرب بندے ہیں جو روز جزا والے دن غم والم سے دور عمدہ پوشاکوں میں اللہ رب العزت کے

سایہ رحمت میں ہوں گے۔

بنت عتیق

کیا آپ بدلے ہیں؟

[ادارہ 'انذار' کا مقصد لوگوں میں ایمان و اخلاق کا شعور پیدا کرنا اور مثبت انداز فکر کو فروغ دینا ہے۔اللہ کے فضل سے اس ادارے کی کوششوں کے نتیجے میں بہت سے لوگوں میں بڑی مثبت تبدیلیاں آ چکی ہیں۔ ذیل میں ایک بہن کی تحریر اسی حوالے سے شائع کی جارہی ہے۔آپ یا آپ کے احباب میں کوئی تبدیلی آئی ہے تو آپ اپنے تجربے کو ہمارے ساتھ شیئر کر سکتے ہیں،ادارہ۔]

بچپن سے لے کر آج تک میں نے یہ آیت شاید سینکروں بار پڑھی اور سُنی ہے۔کبھی اسلامیات کے کورس کی کتابوں میں،کبھی امی،ابو اور نانی کے منہ سے اور کبھی قرآن وحدیث کے مطالعے کے دوران، کہ نماز بے حیائی اور بُری بات سے روکتی ہے۔اور ہمیشہ میرے ذہن میں اسکا مفہوم یہ بنتا کہ ایک نماز کا پابند شخص نیک اور دیندار ہوتا ہے،اور چونکہ نیک لوگ گناہ سے دور رہتے ہیں اس لیے نمازی بے حیائی اور بُری باتوں سے محفوظ رہتا ہے۔اس سے زیادہ گہرائی میں سمجھنے کی نہ میں نے کوشش کی اور نہ کسی نے سمجھایا۔

سر ابویحییٰ کی کتابیں بالخصوص ''قسم اُس وقت کی'' پڑھنے کے بعد سے میری نمازوں میں جو تغیر آیا ہے،اس کے لیے اللہ تعالیٰ سر ابویحییٰ کو بہترین جزا دیں۔اب دل یہ چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے بھی ناعمہ کی طرح سچی ہدایت سے نوازیں۔میرے دل میں بھی اس مالکِ دو جہاں کی محبت کے چشمے پھوٹنے لگیں جس نے اس دل کو دھڑکنا سکھایا ہے۔میں بھی عبداللہ کی طرح زندگی کے ہر

موڑ، ہر مسئلے، ہر پریشانی، ہر خوشی میں اس رب کائنات کو یاد رکھوں جس کے احسانوں کے بوجھ تلے میرا رواں رواں دبا ہوا ہے۔ میں اس کی تخلیق کو دیکھ کر اسکی عظمت کو پہچاننا سیکھ جاوں۔ اس سے بے پناہ محبت کرنا سیکھ جاوں جو مجھے اس دنیا میں سب سے زیادہ پیار کرتا ہے۔ ان احساسات کے ساتھ جب میں نماز پڑھتی ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے تعالیٰ نے مجھے اپنے دربار میں طلب کیا ہے۔ میں اپنے خالق و مالک کے سامنے کھڑی اسکی عظمت کا اعتراف اور اپنی تڑپ کا اظہار کر رہی ہوں۔ رکوع میں جھکتی ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ قادر مطلق مالک ہے اور میں اسکی ادنیٰ سی خادمہ۔ سجدے میں سر جھکا کر گویا میں اپنے رب سے ایک پختہ عہد باندھ لیتی ہوں کہ اے مالک، میرا وجود، میری خواہشات، میرے احساسات، میرے ارادے سب آپ کے مُطیع، صرف آپکے لیے۔ میں خود کو آپکے سپرد کرتی ہوں۔ آپکے حکم کے خلاف نہ کچھ سوچنا ہے نہ کرنا ہے۔

خدا کے سامنے اسکی عظمت کے اس بیان اور اپنی خود سپردگی کے عہد کے بعد مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرے رب نے مجھے گناہوں سے پاک کر دیا ہے۔

لیکن نہ جانے کیوں میں اپنے بے انتہا مہربان رب کی بے انتہا نافرمان بندی ثابت ہوئی ہوں۔ اس نماز کے بعد بھی میں گناہ کرنے سے باز نہیں آتی۔ کبھی چھوٹے بھائی کو بے وجہ ڈانٹ دینا اور کبھی امّی کے ساتھ تلخ کلامی۔ نہ جانے یہ شیطان ہوتا ہے یا میرا اپنا نفس جو مجھے سب بھُلا دیتا ہے۔ رب کے دربار میں حاضری، اس سے کیا عہد، کچھ بھی تو یاد نہیں رہتا۔

اس وقت نماز اپنا کرشمہ دکھاتی ہے۔ اگلی نماز کے لیے جب میں قیام میں کھڑی، اپنے آپکو رب کے دربار میں کھڑا محسوس کرتی ہوں تب یکا یک اپنا گناہ یاد آ جاتا ہے۔ شرمندگی اور ندامت مجھے چاروں طرف سے گھیر لیتی ہے۔ میرے منہ سے الفاظ ادا نہیں ہو پاتے۔۔۔ یوں لگتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ مجھ سے بہت ناراض ہیں۔ پھر اپنی نماز محض ایک دکھاوا اور ڈھکوسلہ لگنے لگتی ہے۔ جب خدا

کی بات ہی نہ مانی تو پھر یہ بڑے بڑے وعدے اور اسکی عظمت کے بیان کیا معنی؟ اس احساس کے ساتھ ہی آنسو بہنے لگتے ہیں۔ کئی بار تو ایسا ہوا کہ میں نے نماز توڑ کر امی سے معافی مانگی، انہیں منایا اور پھر اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کی۔ تب کچھ سکون حاصل ہوا اور میں نماز ادا کر سکی۔

ایسا ایک بار نہیں بار بار ہوا۔ اور ہر بار میرے مالک نے مجھے میرے گناہ کا احساس دلایا، مجھے توبہ کی توفیق دی اور میرے دل کو مطمئن کیا۔ اس سلسلے پر غور کرتی ہوں تو آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ ہم پر کتنا مہربان ہے ہمارا رب کہ اس نے ہمیں نماز کا تحفہ عطا کیا۔ اگر دن میں پانچ بار خدا کے دربار میں یہ حاضری لازم نہ ہوتی تو کسی شخص کو بھی اپنے گناہوں کا ادراک اس شدت سے نہ ہو پاتا، نہ شرمندگی ہوتی اور نہ وہ اس گناہ کو ترک کر پاتا۔

اللہ کا شکر ہے اب میں ان گناہوں کو ترک کرنے میں کافی حد تک کامیاب ہوگئی ہوں جو مجھے بہت معمولی لگا کرتے تھے مگر خدا کی ناراضی کا سبب بن جاتے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ اتنے رحیم ہیں کہ وہ ناراض ہو کر بھی ہمیں اپنی ناراضی دور کرنے کا طریقہ سکھا دیتے ہیں۔

نماز اپنے رب سے ملاقات ہی کا تو نام ہے۔ اور اس ملاقات میں ہمارا رب ہمیں میل کچیل سے پاک کر کے ملاقات کے لیے تیار کر دیتا ہے۔ ہمیں کوئی دوسرا [illegible] نہیں ملے گا۔ کیونکہ وہ اپنے بندوں سے بہت محبت کرتا ہے

اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک نصیحت اور سینوں کے امراض کی شفا اور اہل ایمان کے لیے ہدایت و رحمت آ گئی ہے۔ اے نبی کہہ دیجیے کہ یہ (قرآن) اللہ کے فضل و رحمت سے (اترا ہے)۔ اس پر تو لوگوں کو خوشیاں منانی چاہئیں۔ یہ ان سب چیزوں سے بہتر ہے جنہیں لوگ جمع کر رہے ہیں۔

(یونس 57-58:10)

ابو یحییٰ

سورۃ البقرہ (2)

سورہ بقرہ کی تمہید کے تین مضامین

ہم سورہ بقرہ کی تمہید کا مطالعہ کررہے ہیں جو آیت 1 تا39 پر مشتمل ہے۔اس تمہید میں تین بنیادی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ایک یہ کہ ہدایت کی آسمانی بارش یعنی قرآن مجید کے نزول کے بعد مختلف گروہوں یعنی ماننے والے، منکرین اور منافقین کا کیا رویہ سامنے آیا ہے۔اس کا مطالعہ پیچھے کیا جاچکا ہے۔دوسری چیز یہ کہ یہ آسمانی ہدایت کیا ہے، یہ عقل وفطرت کے کن بنیادی دلائل پر استوار ہے، نیز اسے ماننے اور نہ ماننے کا انجام کیا ہے۔یہ حصہ انشاء اللہ آج زیر بحث آئے گا۔تیسرا یہ کہ اس ہدایت کا تاریخی پس منظر کیا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی کس اسکیم کے تحت دی جارہی ہے۔

یہ دوسرا مضمون آیت نمبر 21 تا 29 میں بیان ہوا ہے۔ان آیات کا ترجمہ درج ذیل ہے جس کے بعد ہم ان آیات میں زیر بحث آنے والے ان مضامین اور موضوعات میں سے ایک ایک کو لے کر ان پر بات کریں گے۔

”لوگو، تم اپنے اس پروردگار کی بندگی کرو، جس نے تمھیں پیدا کیا ہے اور تم سے پہلوں کو بھی، اس لیے کہ تم (اس کے عذاب سے) بچے رہو۔(وہی) جس نے تمھارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا ہے اور آسمان سے پانی اتارا ہے، پھر اس نے تمھاری روزی کے لیے طرح طرح کے میوے پیدا کردیے ہیں۔لہذا تم اللہ کے ہم سر نہ ٹھہراؤ، دراں حالیکہ تم (ان سب باتوں کو) جانتے ہو۔

(یہی، اس کتاب کی دعوت ہے، اسے قبول کرو)، اور جو کچھ ہم نے اپنے بندے

پر نازل کیا ہے، اس کے بارے میں اگر تمھیں شبہ ہے تو (جاؤ اور) اس کے مانند ایک سورۃ ہی بنا لاؤ اور (اس کے لیے) خدا کے سوا تمھارے جو زعما ہیں، انھیں بھی بلا لو، اگر تم (اپنے اس گمان میں) سچے ہو۔ پھر اگر نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر سکو گے تو اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن وہ لوگ بھی ہوں گے (جو نہیں مانتے) اور ان کے پتھر بھی (جنھیں وہ پوجتے ہیں)۔ وہ انھی منکروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ اور ان کو جو (اس کتاب پر) ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، اس بات کی بشارت دو، (اے پیغمبر) کہ ان کے لیے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ ان کا کوئی پھل جب انھیں کھانے کے لیے دیا جائے گا تو کہیں گے: یہ وہی ہے جو اس سے پہلے ہمیں دیا گیا، دراں حالیکہ ان کو یہ اس سے ملتا جلتا دیا جائے گا، اور ان کے لیے وہاں پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔

(یہ جنت کی تمثیل ہے، اور) اللہ اس بات سے نہیں شرماتا کہ (کسی حقیقت کی وضاحت کے لیے) وہ مچھر یا اس سے بھی حقیر کسی چیز کی تمثیل بیان کرے۔ پھر جو ماننے والے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ یہ ان کے پروردگار کی طرف سے حق آیا ہے، اور جو نہیں مانتے، وہ کہتے ہیں کہ اس مثال سے اللہ نے کیا چاہا؟ (اس طرح) اللہ بہتوں کو اس سے گمراہ کرتا اور بہتوں کو راہ دکھاتا ہے، اور (حقیقت یہ ہے کہ) وہ اس سے گمراہ تو ایسے سرکشوں، ہی کو کرتا ہے جو اللہ کے عہد کو اس کے باندھ لینے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور اللہ نے جس چیز کے جوڑنے کا حکم دیا ہے، اسے کاٹتے ہیں، اور (اس طرح) زمین میں فساد برپا کرتے ہیں۔ یہی ہیں جو (دنیا اور آخرت، دونوں میں) نامراد ہیں۔

(لوگو)، تم اللہ کے منکر کس طرح ہوتے ہو، دراں حالیکہ تم مردہ تھے تو اس نے تمھیں زندگی عطا فرمائی، پھر وہی مارتا ہے، اس کے بعد زندہ بھی وہی کرے گا، پھر اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ وہی ہے جس نے تمھارے لیے زمین کی سب چیزیں پیدا

کیں، پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور سات آسمان استوار کر دیے، اور وہ ہر چیز سے واقف ہے۔(البقرہ 2:29-21)‘‘

ہدایت کی بنیاد: عقیدہ توحید

ہدایت کی پہلی اور بنیادی اساس عقیدہ توحید ہے یعنی انسانوں کا خالق و مالک اللہ پروردگار عالم ہے جس نے نہ صرف یہ کہ انہیں پیدا کیا ہے بلکہ وہ ہر آن اور ہر لمحہ ان کی زندگی اور پرورش کے تمام اہتمام کر رہا ہے۔ پوری کائنات کو اس نے اسی خدمت میں لگا رکھا ہے۔ چنانچہ وہ اس بات کا مستحق ہے کہ تنہا اسی کی عبادت کی جائے اور اس کی بندگی میں کسی کو شریک نہ کیا جائے۔

توحید یا دعوت عبادت رب ہر نبی کی دعوت کا مرکزی خیال رہا ہے۔ تاہم قرآن مجید کا یہ اعجاز ہے کہ اس نے نہ صرف اس بنیادی مطالبے کو نہ صرف انتہائی شرح و وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے بلکہ اس دعوت کے حق میں عقل و فطرت کے ایسے دلائل بھی پیش کیے ہیں جن کا کوئی معقول انسان انکار نہیں کر سکتا۔ یہ چیزیں قران مجید میں جگہ جگہ بکھری ہوئی ہیں اور جیسے جیسے زیر بحث آئیں گی انشاءاللہ ہم انہیں زیر بحث لائیں گے۔

عقیدہ توحید کی بنیادی دلیل: ربوبیت

اس مقام پر دعوت عبادت رب کے ساتھ اس دعوت کی ایک بنیادی دلیل یہ دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس لیے عبادت کے مستحق ہیں کہ وہی ہر نعمت کے عطا کرنے والے ہیں۔ زمین کا بچھونا، آسمان کی تاروں بھری محفوظ چھت اور ان کے بیچ میں کھانے اور پینے کے لامحدود انتظامات صرف اسی کی بخشش کا نتیجہ ہے۔ جب دینے والا وہی ہے تو جواب میں بندگی بھی اسی کی ہونی چاہیے۔

یہ ایسا ہی ہے کہ انسان جس سے تنخواہ لیتا ہے، کام بھی اسی کا کرتا ہے۔ یہ قطعی طور پر غیر اخلاقی اور غیر قانونی بات ہے کہ تنخواہ کسی سے لی جائے اور کام کسی اور کا کیا جائے۔ ٹھیک اسی طرح اگر ساری نعمت اللہ کی عطا کردہ ہے تو یہ کیسے درست ہے کہ عبادت غیر اللہ کی ہو۔ چنانچہ یہ بالکل غلط ہے کہ اللہ کی نعمتوں میں رہ کر غیر اللہ کی عبادت کی جائے۔

دعوت رسالت اور اس کی دلیل

یہی وہ بنیادی دعوت ہے جسے لے کر تمام انبیا اور بالخصوص آخری نبی حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ہیں۔اور ختم نبوت کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اس دعوت کو ہمیشہ کے لیے قرآن مجید کی محفوظ شکل میں چھوڑ کر رخصت ہوئے ہیں۔

رسالت اور کتاب الٰہی پر ایمان دین کی اساسی دعوت ہے،جس کی سچائی کے متعدد دلائل قرآن مجید میں دیے گئے ہیں۔مگر اس مقام پر اس بنیادی دلیل کا ذکر ہے جو قرآن مجید کے اولین مخاطبین کو دی گئی تھی۔یعنی اگر تمھیں اس کتاب کی سچائی میں شک ہے اور تم سمجھتے ہو کہ یہ انسانی تصنیف ہے تو تم زبان و بیان کے ماہر ہو۔ایسا کرو کہ اس کتاب کے مقابلے کی اس معیار کی ایک سورۃ ہی بنا لاؤ۔

سورہ بقرہ میں یہ چیلنج عرب کے لوگوں کو آخری دفعہ دیا گیا تھا۔اس سے قبل مکہ میں کئی دفعہ انہیں یہ چیلنج دیا گیا تھا۔مگر مشرکین عرب نے کبھی اس چیلنج کا جواب دینے کی کوشش نہ کی۔حالانکہ یہ ان کے لیے نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو غلط ثابت کرنے کا سب سے آسان طریقہ تھا کہ وہ اپنے بہترین شعراء کو اکھٹا کرتے جس طرح فرعون نے جادوگروں کو حضرت موسیٰ کے مقابلے کے لیے کیا تھا اور ایک جواب تیار کر کے سامنے رکھ دیتے۔مگر وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ ایسا کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔چنانچہ کفار مکہ نے اس دعوت کا زور توڑنے کے لیے ہر ممکنہ قدم اٹھایا،مگر کبھی بھی اس چیلنج کا جواب دینے کی کوشش نہیں کی۔یہی قرآن مجید کی سچائی کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

سزا و جزا

اتنے واضح دلائل کے ساتھ لوگوں تک اللہ کا پیغام پہنچ جانا ہی وہ بنیاد ہے جس کی وجہ سے قیامت کے دن ان کی سخت جوابدہی ہوگی۔چنانچہ اس روز نہ ماننے والوں کو ان کے کفر و سرکشی کی پاداش میں ابدی جہنم میں جگہ دی جائے گی۔جبکہ ماننے والوں کا ٹھکانہ ہمیشہ رہنے والی جنتیں ہوں گی۔جنت کے حوالے سے یہاں چند باتیں اہم ہیں۔پہلی یہ کہ باغات اور بہتی نہروں کی تعبیر خاص عرب کے پس منظر میں ہے جہاں کے شدید گرم موسم اور تپتے صحرا میں انعام کا اس سے بہتر تصور ممکن نہیں۔

دوسرے یہ کہ انعام کی زندگی ابدی ہوگی جسے موت کی کسی آہٹ کا کوئی کھٹکا نہ ہوگا۔ تیسرے یہ کہ یہ ابدی زندگی کبھی بوریت میں نہیں بدلے گی کیونکہ یہاں ہر دفعہ ملنے والی نعمت پچھلی نعمت سے جدا اور منفرد ہوگی۔ یوں نعمتوں کا یہ تنوع انسانوں کے ذوق جمال کو ہمیشہ شاداب رکھے گا۔ چوتھے یہ کہ اس زندگی میں خوشی کا رنگ بھرنے کے لیے وہاں پاک و وصاف بیوی کی وہ رفاقت ہوگی جو ہر نعمت کو حسین تر بنا دے گی اور جس کے بغیر ہفت اقلیم کی بادشاہی بھی بے مزہ ہے۔

مطلوب کردار

اللہ تعالیٰ کی سزا و جزا کی بنیاد کچھ حقیقتوں کا مان لینا ہی نہیں بلکہ عملی طور پر اس کردار کے سانچے میں اپنی سیرت کو ڈھال دینا ہے جو اللہ تعالیٰ کو عین مطلوب ہے۔ اس کردار کے لوگ اعلیٰ اخلاق کے مطابق زندگی گزارتے ہیں۔ جبکہ نہ ماننے والے واضح ترین سچائی کے مقابلے میں بھی مین میخ نکالتے ہیں۔ یہ لوگ صریح دلائل کے جواب میں نکتہ آفرینی کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ جیسے کہ جب وہ قرآن کا جواب نہیں لا پاتے تھے تو اپنی خفت مٹانے کو کہتے کہ یہ بھی کوئی اعلیٰ کلام ہے جس میں حقیر چیونٹی اور مکھی کا ذکر ہو۔ یہ سر تا سر کج بحثی ہے۔ جبکہ عملی طور پر بھی ان کا رویہ زمین میں فساد برپا کرنے، قطع رحمی کرنے اور اللہ کے عہد کو پامال کرنے کا ہوتا ہے۔

آخرت کی زندگی اور اس کی دلیل

سزا و جزا کے حوالے سے یہ باتیں واضح کرنے کے بعد پھر آخری بنیادی عقیدے کا بیان ہے۔ کہ اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے۔ اس زندگی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ پہلے عدم سے وجود میں لا چکے ہیں۔ وہ اس کی قدرت رکھتے ہیں کہ اسے مرنے کے بعد دوبارہ بھی پیدا کر سکیں۔ صرف یہی نہیں ان کی قدرت وہ ہے جس نے ساری کائنات کو تخلیق کیا۔ انسان جیسی عظیم صناعی کو تخلیق کیا۔ وہ کیوں انسانوں کو دوبارہ پیدا نہیں کر سکتا۔ کیوں وہ جنت اور جہنم کے اپنے وعدوں کو پورا نہیں کر سکتا۔ یہ آخرت کی بنیادی دلیل ہے جسے ہم دلیل قدرت کہتے ہیں۔

[جاری ہے]

مبشر نذیر

ترکی کا سفرنامہ (3)

ہمارے لئے پہلے راستے میں کشش یہ تھی کہ اس طرح کربلا، نجف، بابل، بغداد، نینوا اور موصل کے تاریخی مقامات دیکھنے کو مل جاتے مگر اس میں جان، مال اور آبرو خطرے میں نظر آ رہی تھی۔ دوسرا راستہ نسبتاً محفوظ تھا۔ میرے ایک کولیگ اطہر کے کچھ رشتے دار "عرعر" میں رہتے تھے۔ میں نے اطہر کے ذریعے ان سے رابطہ کیا اور عرعر بارڈر کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ معلوم ہوا کہ عرعر کا بارڈر صرف رمضان اور حج سیزن میں عراق کے حاجیوں کے لئے کھولا جاتا ہے۔ عام طور پر محض ٹرک وغیرہ سامان لے کر آتے جاتے ہیں۔ کاروں کے ذریعے بارڈر کراس کرنے کا یہاں رواج نہیں ہے۔

اب ایک نئی مصیبت پیدا ہوگئی کہ عراق میں داخل ہونے کے لئے کویت کا ویزا بھی حاصل کرنا پڑتا۔ "سالمی" بارڈر سے ہم کویت میں داخل ہوتے اور محض 100 کلومیٹر کا سفر کر کے "عبدلی" بارڈر سے عراق جا پہنچتے۔ میں اب سفارت خانوں کے چکر کاٹ کر تنگ آ چکا تھا اور معاملہ شیطان کی آنت سے زیادہ طویل ہو چکا تھا۔ ویسے یہ میں نے محض محاورتاً کہا ہے ورنہ کبھی شیطان کی آنت کی پیمائش کا اب تک مجھے اتفاق نہیں ہو سکا ہے۔

اب ہمارے پاس ایک ہی راستہ باقی بچا تھا اور وہ یہ تھا کہ ہوا میں طویل چھلانگ لگا کر اردن کو عبور کرتے ہوئے شام میں داخل ہوں۔ جدید سائنسی ترقی نے یہ چھلانگ ممکن بنا دی تھی۔ جدہ سے دمشق اور حلب کے لئے براہ راست فلائٹس چلتی ہیں۔ میں نے مختلف ٹریول ایجنٹس سے معلوم کیا تو علم ہوا کہ اگلے دو ماہ تک کوئی سیٹ دستیاب نہیں ہے البتہ ترکی کی فلائٹس میں چند سیٹیں بمشکل دستیاب تھیں۔ اب اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا کہ شام کے سفر کو ملتوی کرتے ہوئے صرف ترکی ہی پر گزارہ کر لیا جائے چنانچہ ہم نے یہی کیا۔

میرے ایک جاننے والے فلپائنی ٹریول ایجنٹ ڈینی نے جوڑتوڑ کر کے سستی ترین سیٹوں کا انتظام کیا اور ہم روانہ ہونے کے لئے تیار ہو گئے۔ میں نے جدہ کے "بلد" میں واقع ایک منی ایکس چینج سے ترکی لیرا اور امریکی ڈالر حاصل کیے۔ میری اہلیہ نے سامان پیک کیا۔ ہمارے ساتھ ہماری چھوٹی بیٹی ماریہ بھی جا رہی تھی۔

معلومات کا حصول

سفر کی تیاری کے لئے میں ساتھ ساتھ معلومات حاصل کرتا جا رہا تھا۔ شام کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے میں نے اپنے ایک شامی شاگرد امین کرید سے رابطہ کیا۔ یہ سن کر کہ میں شام جا رہا ہوں، وہ مجھ سے بھی زیادہ پرجوش ہو گئے۔ انہوں نے ایک ہی دن میں شام میں ہماری رہائش سے لے کر سیر و تفریح کے تمام انتظامات مکمل کر دیے۔ جب ہمیں مجبوراً شام کا سفر ڈراپ کرنا پڑا تو مجھ سے زیادہ مایوسی امین کو ہوئی۔ ان کے والد شام کے شہر "ادلب" میں میرے منتظر تھے۔ میں ان سے معذرت ہی کر سکتا تھا۔

میں نے اپنے ایک اور شاگرد محمد صوفی سے رابطہ کیا جن کا تعلق ترکی کے شہر انقرہ سے تھا۔ انہوں نے مجھے بہت سی معلومات فراہم کیں اور اس کے ساتھ ساتھ ترکی زبان کے چند ایسے حروف سکھا دیے جو انگریزی میں استعمال نہیں ہوتے۔ ان کی ضرورت اس وجہ سے تھی کہ میں ترکی میں سائن بورڈز وغیرہ پڑھ سکوں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ترکی حرف 'Ç' 'چ' کی، 'غ' کی، اور 'ش' کی آواز دیتا ہے۔ اس کے علاوہ H بسا اوقات 'خ' کے طور پر، T کو 'د' اور C کو 'ج' کے طور پر استعمال بھی کیا جاتا ہے۔

اگر انسان کسی ملک میں داخل ہونے سے پہلے اس کا سفرنامہ پڑھ لے تو اس سے بہت آسانی ہو جاتی ہے۔ میں نے ترکی کے تین سفرنامے پڑھے، پہلا مستنصر حسین تارڑ صاحب کا "نکلے تیری تلاش میں"۔ انہوں نے غالباً 1960 کے عشرے میں بذریعہ سڑک پاکستان سے یورپ کا سفر کیا تھا جس میں ترکی بھی شامل تھا۔ دوسرا سفرنامہ دنیا بھر کے سیاحوں کے روحانی مرشد ابن بطوطہ کا "تحفۃ النظار فی غرائب الامصار و عجائب الاسفار" تھا۔ ابن بطوطہ نے

1330-31ء میں ترکی کا سفر کیا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب نہ تو ہوائی جہاز تھے اور نہ ہی پکی سڑکیں۔ ان کی ہمت کو داد دینا پڑتی ہے۔ تیسرا سفرنامہ ایک امریکی مصنف مارک آر لیپر کا تھا جنہوں نے 1998ء میں ترکی کا سفر کیا تھا۔ اس طرح تین مختلف زبانوں اور ادوار کے افراد کا تجربہ مجھے حاصل ہو چکا تھا۔

اس کے علاوہ انٹرنیٹ پر ترکی سے متعلق بہت سا مواد موجود تھا۔ www.turkeytravelplanner.com اور www.allaboutturkey.com سے مجھے بہت سی قیمتی معلومات حاصل ہوئیں۔ اب سے بیس برس پہلے تک بڑی مشکل سے چند بروشر اور نقشے ملا کرتے تھے مگر اب میں اپنے کمپیوٹر پر بیٹھ کر ترکی کی ایک ایک سڑک کا جائزہ لے سکتا تھا۔ یہ انفارمیشن ایج کا کمال ہے۔ اس دور نے ہمارے لئے یہ ممکن بنا دیا ہے کہ ہم اپنے دین کی حقیقی دعوت کو دنیا کے سامنے پہنچا دیں۔ خوش قسمتی سے اس معاملے میں ہم غافل نہیں ہیں اور ہمارے بھائی اس کام میں دن رات محنت کر رہے ہیں۔

روانگی برائے ترکی

جولائی کے آخری ایام تھے۔ جدہ میں گرمی اپنے عروج پر تھی۔ میری گاڑی کا تھرما میٹر روزانہ 45-40 سینٹی گریڈ کی خبر سنایا کرتا تھا۔ فلائٹ صبح دس بجے تھی اس وجہ سے ساڑھے چھ بجے ایئر پورٹ پہنچنا ضروری تھا۔ اطہر نے اپنے جاننے والے ایک ٹیکسی والے کو کہہ دیا۔ یہ صاحب صبح چھ بجے آ پہنچے۔ راستے میں بتانے لگے کہ وہ تیس سال سے جدہ میں مقیم ہیں۔ پہلے وہ ٹرک چلاتے تھے مگر اس میں مسئلہ یہ تھا کہ ریاض اور دمام کے طویل سفر کرنا پڑتے تھے جبکہ وہ ایسا کام چاہتے تھے کہ جس میں روزانہ شام کو گھر آ سکیں اور اگر کام کا دل نہ چاہے تو نہ جائیں۔ چنانچہ انہوں نے ٹیکسی چلانا شروع کر دی۔

زندگی میں لچک کی اہمیت

حقیقت یہ ہے کہ کام ہو یا زندگی کا کوئی اور معاملہ، اس میں لچک (Flexibility) کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی ممالک کی اچھی کمپنیوں میں اب Flexible

کی سہولت دی جاتی ہے۔ دفتر میں تین سے چار گھنٹے ایسے ہوتے ہیں جس میں سب hours
موجود ہوں۔ اس کے علاوہ اگر آپ صبح کے وقت زیادہ اچھے طریقے سے کام کر سکتے ہیں تو صبح چھ
بجے کام شروع کیجیے اور دو بجے دوپہر گھر چلے جایئے۔ اگر آپ شام میں بہتر کام کر سکتے ہیں تو
11 بجے دفتر آ جایئے اور 7 بجے شام گھر چلے جایئے۔

کمپنیاں یہ سہولت ملازمین کے فائدے کے لئے نہیں دیتیں بلکہ اس میں ان کا اپنا مفاد ہے
کہ انہیں اس طریقے سے توانائی اور تخلیقی صلاحیت سے بھرپور کارکن میسر آ جاتے ہیں۔ ہمارے
بیوروکریٹک معاشروں میں کام سے زیادہ نام نہاد ڈسپلن کو اہمیت دی جاتی ہے جس کی وجہ سے
ملازم جسمانی طور پر تو دفتر میں ٹھیک وقت پر نظر آ رہا ہوتا ہے مگر اس کا دماغ کام کی بجائے آرام
میں مصروف ہوتا ہے۔ اسی طرح شام میں لیٹ سٹنگ کارکنوں کی ذہنی، تخلیقی اور جسمانی
صلاحیتوں کو زنگ لگا دیتی ہے۔ کارکن کمپنی کو وقت تو زیادہ دیتا ہے مگر اس کی پیداواری صلاحیت
(Productivity) بہت ہی کم ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کارکن کی صحت اور خاندانی
زندگی جس طریقے سے برباد ہوتی ہے، وہ اس کی پیداواری صلاحیت کو تباہ کر کے رکھ دیتی ہے۔
یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں لوگ جلد بوڑھے ہو جاتے ہیں۔

ایئرپورٹ پہنچ کر سامان بک کروانے اور امیگریشن کے معاملات سے فارغ ہونے کے بعد
ہم لاؤنج میں آ بیٹھے۔ سعودی عرب سے باہر جانے والوں کا سامان چیک نہیں کیا جاتا۔ صرف
"ہینڈ کیری" میں جو سامان ہو اسے مشینوں کی مدد سے چیک کیا جاتا ہے۔

انسانوں سے محبت

جدہ کا ایئرپورٹ تقریباً تیس سال پرانا ہے۔ اس وجہ سے یہاں سہولیات اس درجے کی نہیں
ہیں جیسی عرب ممالک کے دیگر ایئرپورٹس پر نظر آتی ہیں۔ حال ہی میں اس ایئرپورٹ کی تزئین نو
کی گئی ہے۔ اس وقت بھی کام چل رہا تھا۔ پائپوں کو ایک دوسرے سے جوڑ کر ان پر تختے رکھے
گئے تھے جن پر کھڑے کاریگر کام کر رہے تھے۔ ایک طویل سیڑھی بھی موجود تھی جس پر کھڑے ہو
کر چھت کی تزئین کی جا رہی تھی۔ ہم کام والی جگہ سے تھوڑی دور آ کر بیٹھے تھے۔ اچانک مجھے

عین اپنے سر کے اوپر آواز سنائی دی، "اودروں پھڑیں"۔ کام والی سیڑھی میرے پیچھے آ چکی تھی اور اس پر سوار کاریگر ایک دوسرے سے گفتگو کر رہے تھے۔ مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ یہ صاحب کہیں کوئی چیز میرے سر پر نہ گرا دیں۔

یہ ہمارے کاریگر تھے جو اپنے کام کے معیار کے لئے پورے عالم عرب میں مشہور تھے۔ کمپنیاں مشکل کاموں کے لئے پاکستانی یا ہندوستانی کاریگروں کا انتخاب کرتی ہیں۔ اللہ تعالی نے ہماری قوم کو بہت سی تخلیقی اور جسمانی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ اگر ہم لوگ اخلاقی اعتبار سے خود کو درست کر لیں تو یقیناً عالمی برادری میں بہت بلند مقام حاصل کرنے کی صلاحیت اللہ تعالی نے ہمیں عطا کی ہوئی ہے۔

جدہ کا ایئر پورٹ کافی جدید ہو چکا تھا۔ میں کام کرنے والوں کا مشاہدہ کرنے لگا۔ میری آنکھیں اس چمک دمک کے پیچھے محنت کرنے والے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھیں۔ کہیں ہنر مند پنجابی نظر آ رہے تھے جو پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلے کو چند منٹ میں حل کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ کہیں محنت کش پٹھان نظر آ رہے تھے جو جدید مشینوں کی مدد کے بغیر زمین کا سینہ چیرنے کی صلاحیت سے مالا مال تھے۔ ادھر کیرالہ کے مالا باری تھے جو محنت اور لگن کے ساتھ اپنا کام کرنے کے لئے مشہور تھے۔ ادھر بنگال کے محنتی کارکنان نظر آ رہے تھے جن پر عرب دنیا کے چھوٹے کاروبار کی معیشت کھڑی ہوئی تھی۔ میری نظر اس سے دور فلپائن اور انڈونیشیا کے کارکنوں کو دیکھ رہی تھی جو اپنے ننھے منے وجود سے بڑے بڑے کام کر رہے تھے۔ مصر، سوڈان، شام، اردن، لبنان اور ترکی کے محنت کش بھی تھے جو اپنی جسمانی و ذہنی صلاحیتوں کو یہاں لگا رہے تھے۔ ان سب کے علاوہ خود عربوں کے باصلاحیت افراد بھی تھے جو ہنر کو درست جگہ استعمال کرنے کا فن جانتے تھے۔

ان تمام افراد میں ایک خصوصیت مشترک نظر آ رہی تھی اور وہ تھی انسانیت۔ یہ سب ایک باپ کی اولاد ہیں۔ حالات نے کسی کو ایک مقام پر رکھا ہے اور کسی کو دوسرے پر۔ ہمارے ہاں لوگ اختلافات کو زیادہ نوٹ کرتے ہیں۔ اس کی بجائے میں ہمیشہ مشترک پہلوؤں پر توجہ زیادہ دیا کرتا ہوں۔ اس سے محبت جنم لیتی ہے۔ دولت، نسب، رنگ، نسل اور علاقے کے مصنوعی فرق کو لوگوں نے بڑھا چڑھا کر بھاری بھرکم دیواروں میں تبدیل کر کے انسانیت کو تقسیم کر دیا ہے۔ کسی کو مصنوعی طور پر بہتر سمجھا جانے

لگا ہے اور کسی کو کمتر۔ اگر انسان اپنے وجود ہی کا جائزہ لے لے تو وہ اس حقیقت کو جان سکتا ہے کہ دوسرے تمام انسان اس کے بھائی اور بہن ہی ہیں اور ان میں موجود فرق محض مصنوعی ہے۔

سعودی عرب ایک ملٹی کلچرل معاشرہ ہے۔ یہاں بہت سی قومیتوں کے افراد اپنے اپنے کلچر کے مطابق زندگی بسر کر رہے ہیں۔ میں جب سعودی عرب آ رہا تھا، اس وقت بعض دوستوں نے مجھے مشورہ دیا کہ فلاں فلاں علاقے کے لوگوں سے بچ کر رہنا۔ یہ ہمارے بارے میں شدید تعصب میں مبتلا ہیں۔ میں نے ان کی نصیحت کو ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیا۔ اس کے بعد مجھے اس کے بالکل برعکس تجربہ ہوا۔ انہی علاقوں کے لوگ مجھ سے محبت کرنے لگے۔ میں انہیں کچھ دے نہیں سکتا۔ میری کوشش یہ ہوا کرتی ہے کہ ہر شخص کے بارے میں ذہن میں مثبت رویہ رکھوں۔ ان کے جذبات و احساسات کا خیال رکھوں اور ان کے ساتھ عزت و احترام سے پیش آؤں۔ دفتر میں صفائی کرنے والے سے لے کر ڈائریکٹر تک ہر فرد کا میں یکساں احترام کرتا ہوں۔

اگر میں پہلے سے ہی اپنے ذہن میں ان اقوام کے بارے میں تعصب پیدا کر لیتا تو یقینی طور پر یہی بات میرے طرز عمل میں چھلکتی اور میرا تجربہ بھی وہی ہوتا جس کی طرف میرے دوستوں نے اشارہ کیا تھا۔ نفرت اور تعصب سے جواب میں بھی نفرت ہی ملتی ہے جبکہ محبت اور احترام کا جواب بھی محبت ہی میں ملا کرتا ہے۔ چند متعصب افراد ہر قوم میں ہوا کرتے ہیں۔ ان کے طرز عمل کی بنیاد پر پوری قوم کے بارے میں کوئی رائے قائم کر لینا بالکل ہی غلط ہے۔ ایسے افراد کا حل یہی ہوا کرتا ہے کہ انہیں مکمل طور پر نظر انداز کر دیا جائے۔

اس سے پہلے یہی تجربہ مجھے کراچی میں حاصل ہو چکا ہے۔ یہاں مختلف لسانی گروہوں کے افراد موجود ہیں جن میں بعض ایک دوسرے کے لئے انتہا پسندی کی حد تک متعصب ہیں۔ میں نے ہر ایک سے متعلق مثبت رویہ اختیار کیا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اردو اسپیکنگ، سندھی، پٹھان، بلوچ اور پنجابی کمیونیٹیز سب میں مجھے مخلص دوست نصیب ہوئے۔ [جاری ہے]

سوال و جواب

ابویحییٰ

صبر کیسے کیا جائے؟

سوال: محترمی و مکرمی

السلام علیکم

میں آپ سے اس سوال کا جواب معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ اکثر مواقع پر زندگی میں مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ صبر پر بات کرنا تو بہت آسان ہے لیکن عملی طور پر صبر کرنا ایک انتہائی مشکل کام ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایک انسان حقیقی معنوں میں صبر کرنا کیسے سیکھ سکتا ہے۔ اور جب کبھی ہم صبر کرنے میں ناکام ہو جاتے ہیں تو کیا احساس ندامت اور زبانی توبہ کافی ہوتی ہے یا اس کا کوئی کفارہ بھی ادا کرنا ہوگا۔ ایک اور سادہ لیکن بہت اہم سوال ہے میرا کہ میں اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا چاہتی ہوں لیکن میں کوئی اچھی مسلمان نہیں ہوں۔ برائے مہربانی مجھے بتائیے کہ میں اللہ تعالیٰ کو کیسے راضی کر سکتی ہوں؟

نورین جواد

جواب: السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

آپ نے بالکل درست فرمایا کہ صبر کرنا ایک مشکل کام ہے۔ صبر حاصل کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ کسی مصیبت پر اللہ تعالیٰ سے درخواست کی جائے کہ وہ اس کا تحمل آسان کر دیں اور صبر عطا فرمائیں۔ دوسرے یہ کہ انسان اس اجر کو پیش نظر رکھیں جو صبر کرنے والوں کو

عطا کیا جائے گا۔قرآن کریم کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ صبر کرنے والوں کا اجر بے حد و حساب دیا جائے گا۔ چنانچہ صبر پر اجر کی امید اس کام کو آسان کر دیتی ہے۔ تیسرا طریقہ ان مصائب کو یاد کرنا ہے جو انبیا و صلحا پر آئے اور انھوں نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا جیسے حضرت ایوب علیہ السلام کے واقعے میں ہمیں تفصیل معلوم ہوتی ہے۔ چوتھا اس چیز کو سمجھنا ہے کہ ہر مشکل میں بھی ہمارے لیے خیر کا کوئی نہ کوئی پہلو ہوتا ہے۔اور ہر محرومی کے بعد بھی اللہ تعالیٰ کی بہت سی نعمتیں باقی رہتی ہیں۔یعنی کچھ کھو کر بھی اور بہت کچھ کھونے کے لیے ہر حال میں ہمارے پاس رہتا ہے۔

ان سب کے ساتھ تاہم اگر کبھی بے صبری اور شکایت کا موقع آ جائے تو اللہ تعالیٰ سے درگزر کی درخواست کر لی جائے وہ بہت معاف کرنے والا ہے۔کسی قسم کے کفارے کی ضرورت نہیں۔

جہاں تک دوسرے سوال کا تعلق ہے تو اللہ کو راضی کرنے کا آسان ترین طریقہ اس کی شکر گزاری ہے۔ زبان سے اس کی نعمتوں کا شکر، دل میں احسانمندی کے جذبات، عمل سے اس کے احکامات کی پابندی، جو نعمتیں ملی ہیں انہیں بندوں پر خرچ کرنا، یہ سب شکر کے طریقے ہیں۔اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں سے شکر گزاری پسند ہے ناشکری نہیں۔ یہی اللہ کو راضی کرنے کا بہترین طریقہ ہے۔

والسلام

ابو یحییٰ

بیوی کے بانجھ پن کی وجہ سے دوسری شادی

سوال: السلام علیکم

برائے مہربانی سورہ شوریٰ 42 آیت 49-50 کی روشنی میں فرمایئے کہ کیا کوئی شخص بیوی کے بانجھ ہونے کی صورت میں اس وجہ سے دوسری عورت سے شادی کرسکتا ہے؟

خیر اندیش عزیر خالد

جواب: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جس آیت کا حوالہ آپ نے دیا ہے وہ یہ بتا رہی ہے کہ یہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہستی ہے جو فیصلہ کرتی ہے کہ کس کو کیا دینا ہے یعنی لڑکے، لڑکیاں یا دونوں اور یہ کسی اور کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ یہ دراصل خالق و مالک کی مکمل قدرت کا بیان ہے اور اس امکان کا بھی قلع قمع کرتی ہے کہ کوئی اور ہستی ایسی ہے جو اس معاملے میں کچھ اختیار رکھتی ہو۔ البتہ اولاد کے حصول کے لیے کوئی شخص آسمانی ہدایت کے دائرے میں رہتے ہوئے اور عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے جو لائحہ عمل اختیار کرنا چاہے کرسکتا ہے اس پر کوئی پابندی نہیں ہے۔

والسلام

ابو یحییٰ

شادی بیاہ کے موقع پر اسراف

سوال: السلام علیکم

میں آپکے تزکیہ نفس پروگرام میں آپ کا سٹوڈنٹ ہوں۔ میں آپ سے ہمارے ہونے والے شادی کی رسومات کے بارے میں قران و حدیث کی روشنی میں جاننا چاہتا ہوں برائے مہربانی میرے چند سوالات کے جوابات بھی دے دیں اور اگر ہو سکے تو اس سلسلے میں کوئی کتاب بھی ریفرنس کے طور پر بتا دیں۔

کیا شادی میں ہونے والی مہندی اور مایوں کی رسمیں جائز ہیں؟

کیا ان رسومات پر بہت زیادہ روپیہ خرچ کرنا ٹھیک ہے؟

قران ہمیں اس سلسلے میں کیا ہدایت دیتا ہے اور سنّت کے طریقے میں شادی کیسے ہو سکتی ہے؟

اسد حسین فاروقی

جواب: السلام علیکم ورحمت اللہ و برکاتہ

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ تاخیر کے لیے معذرت۔ آپ کے سوالات کے جواب حسب ذیل ہیں

الف۔ شادی بیاہ کی رسموں کا تعلق عرف سے ہوتا ہے۔ دین ان کو زیر بحث نہیں لاتا۔ ان میں اگر کوئی اخلاقی قباحت نہیں ہے تو دین کو ان پر کوئی اعتراض نہیں۔ مہندی مایوں کو بھی اس پر قیاس کر لیں۔ ان میں اصلاً کوئی مسئلہ نہیں مگر جس طرح ان کے ساتھ اہتمام اور اسراف کو شامل کر لیا گیا ہے، اسی طرح بعض اخلاقی خرابیاں خاص کر بعض اوقات خواتین کا اجنبی مردوں کے

سامنے رقص وغیرہ اب معمول بن چکے ہیں۔ یہ قباحتیں نکال دی جائیں تو ان کے مباح ہونے میں کوئی سوال نہیں۔

ب۔ بالکل نہیں۔ یہ اسراف ہے۔اس نے شادی کے عمل کو بہت مشکل بنا دیا ہے اور بہت سی بچیاں اور بچے شادی سے رہ جاتے ہیں یا شادی میں تاخیر ہوتی ہے جو خود بڑے مفاسد کا سبب ہے۔

ج۔شادی مرد وزن کے علانیہ ایجاب وقبول کا نام ہے۔اس کے ساتھ ہی شادی ہوجاتی ہے۔خواتین چونکہ ایسے مواقع پر عام مجلس میں نہیں آتیں اس لیے ان کی طرف سے ان کا کوئی وکیل اس بات کا اعلان کر دیتا ہے۔یہی اصل اور بنیادی شرط ہے۔اس موقع پر کچھ وعظ ونصیحت ہوجاتا ہے جسے خطبہ کہتے ہیں۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مرد کو نصیحت کی ہے کہ وہ کوئی دعوت اپنی حیثیت کے مطابق کر دے۔،باقی ساری چیزیں معاشرتی عرف وروایت کی ہیں اور ان کو اسی اصول پر پرکھا جائے گا جو اوپر بیان ہوا ہے۔

والسلام

ابو یحییٰ

مکاتیب

عزیز بیٹی۔۔۔۔۔ 7-05-2013

السلام علیکم ورحمت اللہ وبرکاتہ

اللہ تعالیٰ کا ہم سب پر بڑا احسان ہے کہ اس نے ہمیں اپنے دین کی خدمت کا موقع عطا فرمایا۔ خدمت دین کا یہ کام ایک بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔اس کا بنیادی تقاضہ یہ ہے کہ ہم سے ہرگز کوئی ایسا کام سرزد نہ ہو جو اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا سبب بن جائے۔

کل رات اتفاق سے میں نے فیس بک پر خواتین کے دعوہ گروپ کا جائزہ لیا تو دیکھا کہ اس میں کسی ممبر نے ایک معاصر خاتون اسکالر ڈاکٹر فرحت ہاشمی صاحبہ اور ان کے ادارے الہدیٰ انٹرنیشنل کے خلاف ایک فتویٰ پوسٹ کر رکھا ہے۔اس طرح کی چیزیں کبھی کسی اصلاح کی غرض سے عام نہیں کی جاتیں بلکہ ہماری فرقہ وارانہ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ اس طرح کی چیزوں کا مقصد کسی عالم یا اس کے کام کے خلاف پروپیگنڈے کی ایک مہم چلا کر اسے بدنام کرنا ہوتا ہے۔

اکثر یہ طریقہ کار جھوٹی اور مبالغہ آمیز باتیں پھیلانا، حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا، بات کو سیاق وسباق اور موقع محل سے کاٹنا، بہتان، الزام وغیرہ پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ رویہ آگے بڑھتا ہے اور لوگوں کو غیر مسلم طاقتوں کا ایجنٹ ثابت کرنا، ان کے ایمان اور نیت پر حملے کر کے انہیں کافر قرار دینے تک جا پہنچتا ہے۔اس کی سزا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیان فرمائی ہے کہ یہ الزام لگانے والا اگر جھوٹا ہے تو خود اس کا ایمان سلب ہو جائے گا اور وہ کافر ہو جائے گا۔اس

پورے معاملے پر میں اپنی حالیہ کتاب ''تیسری روشنی'' میں تفصیل سے روشنی ڈال چکا ہوں۔

اس طرح کی کسی چیز کا میرے فیس بک اکاؤنٹ پر پوسٹ ہونا میرے لیے کس درجہ کی ندامت اور شرمندگی کا باعث ہے، اس کا کوئی دوسرا شخص اندازہ نہیں کرسکتا۔ میں رات بھر یہ سوچتا رہا ہوں کہ کل قیامت کے دن اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے حشر کے سخت ترین ماحول میں اس سوال کا جواب دینے کے لیے روک لیا کہ یہ سب تمھارے نام کے ساتھ ہو رہا تھا تو میں کیا جواب دوں گا۔ پتہ نہیں کہ میری بے خبری اس روز میرا عذر بن سکے یا نہیں۔

میں جانتا ہوں اس طرح کی پوسٹ لگانے میں نہ آپ ذمہ دار ہیں نہ آپ کی کوئی اور ساتھی۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ فیس بک پر کوئی بھی آپ کا ممبر بن کر کچھ بھی پوسٹ کرسکتا ہے اور آپ اسے روک نہیں سکتیں۔ اس لیے آپ پر اس کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ اس وقت یہ ممکن ہے کہ خاموشی کے ساتھ اس پوسٹ کو گروپ سے ہٹا دیا جائے۔ مگر میرے نزدیک ہم سب کے لیے توبہ کا راستہ یہی ہے کہ ہم اس گروپ کو فوراً بند کردیں۔ اس لیے کہ ایک مسلمان کے خلاف مہم چلانا اتنا سنگین جُرم ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ نے عذاب عظیم کی وعید کی ہے، (النور 14:24)۔ یہ کام ہم نے ہرگز نہیں کیا، مگر ہمارا فورم اس کام کے لیے استعمال ہوگیا۔ یہ ایک بہت بڑا سانحہ ہوا ہے۔

بیٹی ہم دین کی خدمت کرنا چاہتے ہیں، ہم نے دین کے نام پر دوکان نہیں کھولی کہ ہمیں دوسرے عالم کو بدنام کرکے اس کے متعلقین کو اپنی دوکان پر لانا ہے۔ دین کا کام دین کے کسی حکم کو پامال کرکے نہیں ہوسکتا۔ اس لیے میری آپ سے درخواست ہے کہ فوراً اس گروپ کو بند کردیں ۔ امید ہے کہ ہمارے اس طرز عمل سے آئندہ ایسی کسی چیز کا راستہ بہتر طریقے پر رک سکے گا۔ مزید یہ کہ میرا یہ خط تمام احباب تک پہنچادیں تاکہ کسی تک یہ بیہودہ الزام تراشی اس گروپ کے ذریعے سے پہنچی ہے تو وہ متنبہ ہوجائے۔

اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

والسلام علیکم

ابو یحییٰ

سلسلہ روز و شب

ابو یحییٰ

[حال ہی میں ابو یحییٰ صاحب کے کیے ہوئے خلاصہ قران کی تقاریر کو جو کچھ برس قبل رمضان المبارک میں کی گئی تھیں، رسالے کی ویب سائٹ inzaar.org پر پیش کیا گیا۔ سامعین کی ایک بہت بڑی تعداد نے ان تقاریر کو سنا اور پسند کیا۔ اس خدمت کو سرانجام دینے کے بعد ابو یحییٰ صاحب نے ایک مضمون لکھا تھا جو اس مناسبت سے قارئین کی دلچسپی کے لیے پیش خدمت ہے۔]

رمضان تنہائی کی عبادت ہے

اس دفعہ رمضان میں مجھے تراویح کے بعد قرآن کریم کے ترجمہ و مختصر تفسیر کی خدمت بھی سرانجام دینی پڑی۔ رمضان مبارک کے حوالے سے میرا اپنا رجحان یہ ہے کہ اس مہینے میں انسان کی توجہ تنہائی کی عبادت کی طرف زیادہ ہونی چاہیے۔ مگر اب ہمارے ہاں یہ مسئلہ ہو چکا ہے کہ سال بھر مساجد اور عبادت سے دور رہنے والے لوگ اسی مہینے میں ان کا اہتمام کرتے ہیں۔ ایسے میں قرآن کریم کی دعوت لوگوں تک پہنچانے کا ایک آسان ذریعہ بہر حال رمضان میں حاصل ہو جاتا ہے۔ یوں معاشرے میں نماز تراویح اور دیگر نمازوں کے ساتھ درس قرآن و حدیث وغیرہ کا بکثرت اہتمام کیا جاتا ہے۔ مگر میں ذاتی طور پر رمضان المبارک میں پبلک خطابات سے ہمیشہ گریز کرتا ہوں۔ تاہم اس دفعہ بعض دوستوں کے زیر اہتمام ہونے والی تراویح میں اصل مقرر کی غیر موجودگی کی بنا پر ان دوستوں اور بزرگوں کے اصرار پر مجھے رمضان کریم میں

اس بھاری ذمہ داری کو اٹھانا پڑا۔

تاہم میں ہمیشہ لوگوں اور خاص کر اہل علم کی توجہ اس طرف دلاتا ہوں کہ رمضان کا مہینہ تقریریں کرنے کا نہیں دراصل تنہائی میں اپنے رب سے لو لگانے کا مہینہ ہے۔ یہ لوگوں کو کچھ دینے کا نہیں خود رب سے پانے کا مہینہ ہے۔یہی سیرت طیبہ کا اصل درس ہے۔اور اسی لیے اعتکاف کی وہ عبادت اس ماہ مقدسہ میں مشروع کی گئی جو دنیا بھر سے کاٹ کر انسان کو خدا سے جوڑ دیتی ہے۔ چنانچہ جس شخص کے لیے ممکن ہو اُسے چاہیے کہ اس مہینے میں دنیا سے کٹ کر اپنے رب سے لو لگائے۔

مائیکروفون کا کرشمہ

رمضان سے تقریباً ایک ماہ قبل مجھے ایک مسئلہ پیش آ گیا تھا جس نے پورے رمضان میرے لیے انتہائی تکلیف دہ صورتحال پیدا کیے رکھی۔ وہ یہ کہ میرے گلے اور بولنے کے نظام سے متعلق بعض عضلات میں کچھ تکلیف پیدا ہونے کی بنا پر میرے لیے گفتگو کرنا بہت مشکل ہو گیا۔ میں نے متعدد اسپیشلسٹ کو دکھایا۔حتیٰ کہ Endoscopy تک کرانے کی نوبت پیش آ گئی۔مگر کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ حالانکہ اس تکلیف سے نجات پانے کے لیے میں روزانہ تقریباً درجن بھر گولیاں کھاتا رہا تھا۔

خیر اسی حال میں رمضان مبارک شروع ہو گیا۔ میرے لیے تو بولنا ناممکن تھا، روزانہ ایک گھنٹے تقریر کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میرا خیال یہی تھا کہ میں ایک آدھ دن تک کسی نہ کسی طرح تقریر کرلوں گا، مگر اس کے بعد لازماً مجھے رکنا پڑے گا۔اس اندیشے کے باجود میں نے اللہ کا نام لے کر اس کام کا آغاز کیا اور اس کی عنایت سے یہ ممکن ہو گیا کہ پورے رمضان میں قرآن مجید کا ترجمہ و خلاصہ لوگوں کے سامنے میں بیان کرسکا۔ عالم

اسباب میں، تاہم، اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو اس ناممکن واقعے کو ظہور میں لانے کا ذریعہ بنایا وہ مائیکروفون سسٹم تھا۔ میرے زیر استعمال جو سسٹم تھا وہ انتہائی جدید اور معیاری تھا۔ جس کی بنا پر یہ ممکن ہوا کہ اسٹینڈ کے سہارے مائیک میرے منہ کے قریب رہتا اور میں بمشکل سرگوشی کے انداز میں گفتگو کرتا۔ یہ سرگوشی اتنی ہلکی ہوتی کہ میرے برابر بیٹھا ہوا شخص بھی اس کو نہیں سن سکتا تھا۔ مگر مائیکروفون سسٹم میری اس سرگوشی کو ایک بھرپور اور زوردار آواز بنا کر سامعین تک پہنچا دیتا۔ یوں لوگ میری بات اطمینان کے ساتھ سنتے رہے۔ گو اس طرح سرگوشی کرنے کے نتیجے میں میرے گلے کی تکلیف بہت بڑھ جاتی ۔ بلکہ دوران تقریر ہر روز صورتحال یہ رہی کہ میری نوے فیصد طاقت اور توانائی آواز کو گلے سے باہر نکالنے پر خرچ ہو رہی تھی اور بمشکل دس فیصد توانائی اور توجہ خلاصے، ترجمے، الفاظ و جملوں کی درست ادائیگی اور خیالات کے تسلسل پر مرکوز تھی۔ گرچہ اس فقیر پر یہ اللہ تعالیٰ کا خصوصی کرم ہے کہ حاضرین کے فیڈ بیک کے مطابق یہ فقیر اللہ کے کلام کا اصل پیغام اپنی تمام تر لاچاری کے باجود بھی پہچانے میں کسی نہ کسی درجے میں کامیاب رہا۔ گو اس کی قیمت یہ دینی پڑی کہ اس تقریر کے علاوہ باقی وقت میں خاموش رہتا اور گھر والوں سے بھی اشارے کنائے میں بات کرتا۔ تاہم الحمدللہ جو ذمہ داری تفویض کی گئی تھی اسے میں پورا کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

معجزوں کا دور

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ مجھے یقین تھا کہ میں اس کام کو نہیں کرسکوں گا اور ابتدا ہی میں مجھے سامعین اور منتظمین سے معذرت کرنی پڑ جائے گی۔ لیکن جب آخری عشرہ آیا اور مجھے احساس ہوا کہ اب یہ ممکن ہو چکا ہے تو میں نے پروردگار عالم کا بہت شکر ادا کیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میرا دل انسانیت کے لیے بھی شکر گزاری کے احساس سے بھر گیا۔ کیونکہ ہمارے بنی

کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو ہمیں یہ سکھایا ہے کہ جو شخص انسانوں کا شکر گزار نہیں وہ رب کا بھی شکر گزار نہیں ہوسکتا۔ میرے دل میں ان تمام لوگوں کے لیے احسان مندی کے جذبات پیدا ہو گئے جنھوں نے انسانیت کو نہ صرف مائیکروفون بلکہ اس جیسی دیگر تمام مفید چیزیں دیں۔

میں نے مزید غور کیا تو مجھ پر واضح ہوا کہ دور جدید معجزوں کا دور ہے۔ تمام شعبہ ہائے زندگی میں انسان نے اتنی ترقی کی ہے کہ زمانۂ قدیم کا انسان اس کا تصور کرنے سے بھی قاصر تھا۔ میں چند مثالوں سے اپنی بات واضح کرتا ہوں۔ اسلام آباد سے کراچی کا سفر تقریباً بارہ سو کلومیٹر کا سفر ہے جو بذریعہ ہوائی جہاز دو گھنٹے سے بھی کم وقت میں طے ہوتا ہے۔ یہ سفر زمانۂ قدیم کے انسان کے لیے ہفتوں بلکہ شاید مہینوں کا سفر تھا۔ اسی طرح امریکہ کینیڈا کا سات ہزار کلومیٹر کا سفر اب ایک دن سے بھی کم وقت لیتا ہے۔ سفر سے ہٹ کر ایک اور مثال لیجیے۔ آج کے دور میں فون، انٹرنیٹ اور ٹی وی وغیرہ کے ذریعے ہزاروں میل دور موجود لوگ ایک دوسرے کے ساتھ بالکل ایسے گفتگو کر سکتے ہیں جیسے آمنے سامنے بیٹھے ہوں۔ فاصلوں سے ہٹ کر ذرا علاج معالجے اور صحت کے مسئلے کو لیجیے۔ اس شعبے میں جو ترقی ہوگئی ہے اس کی بنا پر اب پیچیدہ ترین انسانی امراض کا علاج بھی دریافت ہو چکا ہے۔ بڑے بڑے آپریشن اب روزمرہ کی بات ہو چکے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ نہ صرف اوسط انسانی عمر میں بہت اضافہ ہو چکا ہے بلکہ انسانی آبادی چھ ارب سے اوپر ہو چکی ہے۔

دور جدید کی سہولیات اور آسانیوں کی تفصیل اگر بیان کرنے بیٹھیں تو ہزاروں صفحات بھی اس کے لیے کم ہیں۔ جس چیز کی طرف میں توجہ دلا رہا ہوں وہ یہ ہے کہ ان سہولیات کے نتیجے میں حیات انسانی بے حد سہل، آرام دہ، محفوظ اور پرلطف ہو چکی ہے اور زمانۂ قدیم میں جو کچھ بادشاہوں تک کو حاصل نہ ہوتا تھا وہ آج کے عام انسانوں تک کی دسترس میں آ چکا ہے۔

انسانیت، ہم اور خدا کا قانون

مگر اس غور فکر میں جو سب سے زیادہ تکلیف دہ چیز میرے سامنے آئی وہ یہ تھی کہ انسانیت کی اس ترقی میں آج کے مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں۔ آج کا مسلمان بے شعوری کے عالم میں ان میں سے ہر چیز سے بے تکلف استفادہ کر رہا ہے۔ مگر اس کی تخلیق میں اور انسانیت کو آسانی، بھلائی اور منفعت دینے کے اس عمل میں آج کے مسلمانوں کا سرے سے کوئی کردار نہیں۔ ہمارے اردگرد ان گنت جدید چیزیں موجود ہیں۔ کار، بس، بجلی، کمپیوٹر، ائیر کنڈیشن، موبائل، ٹی وی، ٹیلیفون اور ان کے علاوہ ان گنت گھریلو اور دفتری آلات۔ ان میں سے ہر ایک پر نگاہ ڈالیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان میں سے کسی بھی ایجاد کا سہرا آج کے مسلمان کے سر نہیں۔ میرے لیے یہ احساس انتہائی تکلیف دہ تھا کہ ہم نے انسانیت کو کچھ نہیں دیا۔ انسانیت کی موجودہ ترقی، بھلائی اور منفعت میں ہمارا کوئی حصہ نہیں۔

اس موقع پر مجھے نفع بخشی کے حوالے سے پروردگار عالم کا وہ قانون یاد آ گیا جو قرآن کریم میں بیان ہوا ہے۔ سورۂ رعد میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

> اسی نے آسمان سے مینہ برسایا پھر اس سے اپنے اپنے اندازے کے مطابق نالے بہ نکلے، پھر نالے پر پھولا ہوا جھاگ آ گیا۔ اور جس چیز کو زیور یا کوئی اور سامان بنانے کے لیے آگ میں تپاتے ہیں اس میں بھی ایسا ہی جھاگ ہوتا ہے۔ اس طرح اللہ حق اور باطل کی مثال بیان فرماتا ہے۔ سو جھاگ تو سوکھ کر زائل ہو جاتا ہے اور (پانی) جو لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے وہ زمین میں ٹھہرا رہتا ہے۔ اس طرح اللہ (صحیح اور غلط کی) مثالیں بیان فرماتا ہے (تاکہ تم سمجھو)۔ (رعد 13:17)

اس آیت کے مطابق جھاگ جو ایک غیر نفع بخش چیز ہے وہ زمین پر باقی نہیں رہتا جبکہ پانی جو انسان کی ایک بنیادی ضرورت ہے وہ زمین میں ٹھہرا رہتا ہے۔ ٹھیک یہی معاملہ انسانوں کا بھی ہے۔ جو شخص، گروہ یا قوم اپنے اعمال سے خود کو انسانیت کے لیے نفع بخش ثابت کرتی ہے وہی قوم زمین میں اپنی جگہ بنا پاتی ہے۔ جبکہ غیر نفع بخش افراد اور قوم جھاگ کی مانند بے کار ہوتے ہیں۔ اور بے کار چیزوں کا وہی انجام ہوتا ہے جو جھاگ کا ہوتا ہے۔

پدرم سلطان بود

بدقسمتی سے آج مسلمانوں کو ان کے اکثر رہنما یا تو نفرت کی خوراک دے رہے ہیں یا پھر فخر کی۔ وہ انہیں یہ بتاتے ہیں کہ ساری دنیا ان کی دشمن ہے اور ان کی ترقی میں اصل رکاوٹ دوسروں کی سازشیں ہیں۔ وہ انہیں یہ نہیں بتاتے کہ آج کے مسلمان نفع بخشی کی صلاحیت سے محروم ہو چکے ہیں۔ انہوں نے انسانیت کو کچھ نہیں دیا۔ جب کچھ دیا نہیں تو خدا کے قانون کے مطابق مسلمان آج کسی ترقی اور کامیابی کے حقدار بھی نہیں ہیں۔

یہ لوگ نفرت کے زہریلے مواد کے علاوہ خوش گمانیوں کے محل تعمیر کرنے میں بھی اتنے ہی سرگرم ہیں۔ وہ مسلمانوں کو اسلاف کی عظمت کے قصے سناتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ان ماضی کے قصوں سے حال کی تعمیر ممکن ہے۔ ہمارے نصاب میں بچوں کو مسلمانوں کے سائنسی کارنامے پڑھا کر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسی عمل سے مسلمان سائنس میں آگے نکل جائیں گے۔ کسی شخص کا یہ دعویٰ کہ میرا باپ بادشاہ تھا، اس کے حال کو تبدیل نہیں کرسکتا۔ اپنا حال صحیح انداز فکر سے بدلتا ہے۔ یہ حقائق کا اعتراف کرنے سے بدلتا ہے۔ یہ اپنے عمل کی سمت صحیح رخ پر ڈالنے سے بدلتا ہے۔ یہ جذباتی نعروں اور نفرت کی باتوں کے بجائے معقولیت اور امن و محبت کے راستے پر چلنے

سے بدلتا ہے۔ پدرم سلطان بود سے اس دنیا میں کچھ نہیں ہوتا۔

دعوت کا راستہ

مسلمان آج جس حال میں ہیں اس کا سبب کسی اور کی خرابی نہیں مسلمان کی اپنی سوچ کی خرابی ہے۔ جو کچھ اچھائی اور بھلائی انہیں آج حاصل ہے وہ اللہ تعالیٰ کی عنایت اور مہربانی ہے۔ میں اپنی متعدد تحریروں میں تفصیل سے یہ بیان کرتا رہتا ہوں کہ آج مسلمانوں کو حاصل تمام بھلائیاں اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہیں جن کا مقصد صرف یہ ہے کہ مسلمان انسانیت کو حق کا پیغام پہنچا سکیں۔ مسلمان حق کے امین ہیں۔ ان کے پاس دنیا کا سب سے بڑا خزانہ قرآن کریم کی شکل میں موجود ہے۔ اس عظیم نعمت اور اس کے پیغام کو اگر وہ انسانیت تک پہنچانے کا تہیہ کرلیں تو نہ صرف خدا کی نظر میں ان کی قدر و قیمت بڑھ جائے گی بلکہ انسانیت بھی انہیں اپنے سر آنکھوں پر بٹھائے گی۔

ہدایت انسانیت کا حق ہے۔ خدا انسانیت کو اس کا یہ حق ضرور دے گا۔ وہ ہدایت کو اختیار کریں یا نہ کریں، یہ ان کا مسئلہ ہے۔ لیکن ہدایت کا ان تک پہنچنا مقدر ہے۔ اس کام میں کچھ وقت تو لگ سکتا ہے، مگر یہ کام رک نہیں سکتا۔ یہی وقت کا فیصلہ ہے۔

جہاں رہیے اللہ کے بندوں کے لیے باعثِ آزار نہیں، باعثِ رحمت بن کر رہیے۔ اگلی ملاقات تک، اللہ نگہبان۔

شرک کی طرف لے جانے والے رویے

جس نے اللہ کے سوا کسی اور کے نام کی قسم کھائی، اس نے شرک کا ارتکاب کیا۔ (ابوداؤد، رقم: 3251)

تمام شریکوں میں سب سے زیادہ شرکت سے بے نیاز ہوں، لہذا جس نے اپنے کسی کام میں میرے ساتھ کسی دوسرے کو شریک کیا، میں اس سے الگ ہوں اور وہ اسی کا ہے جس کو اس نے میرا شریک بنایا ہے"۔ (ابن ماجہ، رقم 4202)